پاکستانی ادب کے معمار

ابنِ صفی: شخصیت اور فن

محمد فیصل

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

(سلسلہ ۱۲۹)

ابن صفی: شخصیت اور فن

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

پاکستانی ادب کے معمار

ابن صفی: شخصیت اور فن

محمد فیصل

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ : ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

نگرانِ مطبوعات : علی یاسر

مصنف : محمد فیصل

نظرِ ثانی : ڈاکٹر توصیف تبسم

تدوین : اختر رضا سلیمی

اشاعت : 2017

تعداد : 500

ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

مطبع : NUST پریس، اسلام آباد

قیمت (پاکستان) : -/250 مجلد

-/220 غیر مجلد

ISBN NO: 978-969-472-320-4

فہرست

پیش نامہ

"پاکستانی ادب کے معمار" سلسلے کی کتابوں کا بنیادی مقصد، جہاں ایک طرف پاکستانی زبانوں کے اہم لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف کرنا اور انھیں عام قارئین تک پہنچانا ہے، وہیں ادب کے محققین، ناقدین، اور اداروں، ادب کے طالب علموں کو ان کے متعلق بنیادی نوعیت کا تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے کی تمام کتابوں کی نوعیت تعارفی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی و تنقیدی بھی ہے۔

ابن صفی: شخصیت اور فن، اس سلسلے کی ۱۴۹ ویں کتاب ہے، جو آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ابن صفی کا شمار ایسے عبقریوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو زبان اور ادب دونوں کی بھرپور آبیاری کی۔ ان کی کہانیاں ادب کی بہت سی مروجہ اصناف پر پورا اترتی ہیں۔ انھوں نے کسی مخصوص طبقے یا گروہ سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف عوام الناس کے لیے عمدہ، معیاری اور تفریحی ادب تخلیق کیا جس کی بدولت انھیں برصغیر پاک و ہند میں جیسی عوامی مقبولیت ملی وہ کسی اور مصنف کو نہیں مل سکی۔ ہر کتاب کے ہزاروں کی تعداد میں ایڈیشن شائع ہونا ایک اعزاز ہے جو صرف ابن صفی کے حصے میں آیا۔ ابن صفی کی ڈھائی سو سے زائد تخلیقات ان کے قلم کی قوت اور قارئین کرام کے دل میں ان کی عزت کی مظہر ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے قانون کا احترام سکھانے کے ساتھ ساتھ قارئین کی فکری اور ذہنی تربیت کی۔

اس کتاب کے مصنف محمد فیصل، کمپیوٹر سائنس جیسے خشک مضمون میں اعلیٰ ڈگری رکھنے کے باوجود، اردو اور انگریزی ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب انتہائی محبت، عرق ریزی اور محنت سے تحریر کی ہے، جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

نامور ادیب، محقق اور دانشور ڈاکٹر توصیف تبسم کا بھی شکریہ کہ انھوں نے کتاب پر نظر ثانی فرمائی اور بعض اہم مشوروں سے نوازا۔

اس کتاب کی تدوین و تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفقا اختر رضا سلیمی اور علی یاسر کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو حسب سابق یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ آپ کی رائے کا ہمیں انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

Scanned with CamScanner

پیش لفظ

ابن صفی اردو ادب کے اُن نمائندوں میں سے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں اور بیش قیمت ادبی خدمات کے باوجود ہمارے ادبی طبقہ ہائے فکر میں تسلسل سے نظرانداز ہوتے رہے ہیں۔ سرّی ادب کے حوالے سے اپنی ندرتِ فکر اور منفرد اظہار خیال کے یہ یکتائے زمان، نظم و نثر دونوں میدانوں کے شہسوار رہے ہیں۔ اپنی پہلی تخلیق سے برصغیر میں طبع زاد سرّی ادب کا آغاز کرنے والے ابن صفی کی تخلیقات کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے جن میں جاسوسی ناولوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح اور شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔ چند ہی برسوں میں نہ صرف وہ بیسٹ سیلر بن گئے بلکہ برصغیر کے طول و عرض میں لائبریریوں کا قیام عمل میں آیا، جہاں سے لوگ کرائے پر ابن صفی کے ناول پڑھا کرتے تھے۔

بلاشبہ ابن صفی ایک نابغۂ روزگار ادیب و شاعر تھے جو کسی صلے یا ستائش سے بے نیاز ہو کر صرف ادب کی خدمت اور اپنی تحریروں سے قانون کا احترام سکھانے میں ہمہ وقت کوشاں رہے۔ ابن صفی جیسی شخصیت پر راقم کو تحقیق کا موقع دینے پر میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین اور دیگر معاونین کا تہہِ دل سے سپاس گزار ہوں۔

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں مجھ پر بہت سے احباب کا شکریہ واجب ہے جن میں جناب راشد اشرف سرِفہرست ہیں۔ انھوں نے مجھے اس کتاب کے لیے بے شمار آسانیاں فراہم کیں۔ میں جناب احمد صفی فرزند ابن صفی کا از حد ممنون ہوں جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنے خانوادے اور جناب ابن صفی کے متعلق نہایت قیمتی معلومات فراہم کیں۔

بزرگ شاعر، محقق اور استاد ڈاکٹر توصیف تبسم کی اس عاجز کے لیے بے پناہ محبت اور نوازشات کا تو شاید میں شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ ان کی راہ نمائی ہر لحظہ میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی ہے۔ کتاب پر نظر ثانی انھی کی نگاہِ تیز بیں نے کی ہے۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جن کی شفقت اور سرپرستی میں یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ جناب اختر رضا سلیمی اور جناب علی یاسر کی ذاتی دل چسپی اور تحقیقی مشاورت کے لیے بھی میں سپاس گزار ہوں۔

ابنِ صفی کی شخصیت اور کارہائے نمایاں پر مشتمل یہ کتاب اگر محققین کی توجہ، اُن کی شخصیت، اہمیت اور ادبی کارناموں کی جانب منعطف کروانے اور اس سلسلے میں مزید تحقیق کی دعوت دینے میں کامیاب ہوئی تو میں سمجھوں گا کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد پورا ہو گیا۔

محمد فیصل

اسلام آباد

کوائف نامہ۔ ابن صفی

اپریل ۱۹۲۸ء	پیدائش قصبہ نارہ ضلع الہ آباد
نام	اسرار احمد
تخلص	اسرار ناروی
قلمی نام	ابن صفی
مورث اعلیٰ	بابا عبدالنبی (کائستھ کی ذیلی شاخ ورما سے تعلق تھا۔ اسلام قبول کر کے عبدالنبی کا نام اختیار کیا)
والد	صفی اللہ
والدہ	نذیرہ بی بی
دادا	مولوی عبدالنجاح
نانا	سلیم احمد
بہن بھائی	خورشید خاتون
	ایثار احمد
	شفیعہ بی بی
	عذرا ریحانہ
ابتدائی تعلیم	پرائمری اسکول نارہ
میٹرک	دیانند آریہ ویدک (DAV) اسکول الہ آباد
ایف اے	ایونگ کرسچین کالج (Ewing Chiristian College) الہ آباد

بی اے	آگرہ یونیورسٹی
ملازمت	۱۹۴۹۔۱۹۵۲ یادگار حسینی سکول الہ آباد میں بطور مدرس
ازدواجی زندگی	پہلا نکاح فرحت خاتون سے الہ آباد میں ہوا۔ ان کا انتقال قیامِ پاکستان سے قبل ہوا۔ دوسرا نکاح محترمہ ام سلمیٰ خاتون سے ۱۹۵۳ء میں ہوا، جو فرحت خاتون کی فرسٹ کزن تھیں۔ ان سے ابن صفی کے چار صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں ہوئیں۔ تیسرا نکاح فرحت آرا سے ۱۹۶۹ء میں ہوا۔
اولاد	نزہت افروز ڈاکٹر ایثار صفی ابرار احمد ثروت ابرار احمد صفی افتخار احمد صفی محمد صفی
پہلی کہانی	ہفت روزہ "شاہد" میں شائع ہوئی۔ اس وقت ابن صفی جماعت ہفتم کے طالب علم تھے۔
ادارت	مدیر حصہ نظم ماہنامہ "نکہت" الہ آباد ۱۹۴۸ء
طنز و مزاح	۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک سو سے زائد طنزیہ مزاحیہ کہانیاں اور کالم لکھے۔
جاسوسی دنیا	مارچ ۱۹۵۲ء میں "جاسوسی دنیا" کا پہلا شمارہ شائع ہوا، جس میں پہلی بار فریدی اور حمید کے کردار متعارف ہوئے۔
پاکستان ہجرت	اگست ۱۹۵۲ء میں ابن صفی نے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ الہ آباد سے کراچی براستہ بحری جہاز ہجرت کی۔

سلسلہ وار ناولوں کا آغاز

جاسوسی دنیا کے گولڈن جوبلی نمبر "شعلوں کا ناچ" کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد ابن صفی نے سلسلہ وار ناول لکھنا شروع کیے، جس میں ایک کہانی کئی حصوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

جاسوسی دنیا کے ناولوں کی کراچی سے اشاعت

کراچی سے اسرار پبلی کیشنز کے تحت ابن صفی نے ناول نمبر ۲۸ "ٹھنڈی آگ"، ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو شائع کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے تمام ناول کراچی سے شائع ہوتے رہے۔

عمران سیریز

اگست ۱۹۵۵ء میں عمران سیریز کا پہلا ناول شائع ہوا۔ اس ناول میں عمران کا کردار متعارف کروایا گیا۔

فریدی اور عمران کا مشترکہ کارنامہ

۱۹ اپریل ۱۹۵۹ء کو "زمین کے بادل" نامی ناول شائع ہوا، جس میں فریدی اور عمران کو اکٹھے ایک مشن پر روانہ کیا گیا۔ یہ پہلا اور آخری ناول تھا جس میں دونوں ایک ساتھ جلوہ گر ہوئے۔

ابن صفی کی بیماری

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک ابن صفی شیزوفرینیا کا شکار رہے، جس کی بدولت وہ تین سال تک کچھ نہ لکھ پائے۔ اپنی بیماری سے قبل انھوں نے جاسوسی دنیا کا ناول "پرنس وحشی" اور عمران سیریز کا ناول "بے آواز سیارہ" مکمل کیا تھا۔

ابن صفی کی واپسی

ابن صفی "ڈیڑھ متوالے" جیسے یادگار اور دلچسپ مہماتی ناول کے ذریعے اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ جاسوسی ادب کے میدان میں واپس آئے۔ الٰہ آباد، ہندوستان میں "ڈیڑھ متوالے" کی تقریب رونمائی میں ۲۵ نومبر ۱۹۶۳ء کو اس وقت کے وزیر لال بہادر شاستری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی، جب کہ اس کے دوسرے ایڈیشن کی تقریب رونمائی ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اترپردیش کے وزیر قانون و انصاف سید علی ظہیر (معروف ترقی پسند ہندوستانی ادیب سید سجاد ظہیر کے بھائی) کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔

ابن صفی بطور فلم نویس

ابن صفی نے ۱۹۷۳ء میں فلم "دھماکا" کی کہانی لکھی۔ اس فلم کی ہدایت کاری قمر زیدی نے کی تھی۔ ابن صفی نے اس فلم کے مکالمے اور گیت بھی لکھے۔ حتیٰ کہ ہیروئن کے کپڑے بھی انھوں نے ہی ڈیزائن کیے۔ یہ فلم کراچی میں ۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی لیکن چند تکنیکی وجوہ کی بنا پر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

وفات

۱۹۷۹ء کے اواخر میں ابن صفی ایک بار پھر بیمار ہوئے۔ اس بار وہ بڑی جان لیوا بیماری کینسر کا شکار ہوئے۔ تشخیص کے مطابق انھیں لبلبے کا کینسر تھا۔ اس مرض میں ابن صفی کا انتقال ۲۵ اور ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء (۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۰ ہجری) کی درمیانی رات فجر سے کچھ پہلے ہوا۔

☆☆☆☆

حالاتِ زندگی

خاندانی پس منظر

کسے خبر تھی کہ الٰہ آباد کا ایک چھوٹا سا قصبہ "نارا" تاریخِ ادب میں یادگار قرار پائے گا۔ یہ اہمیت کسی عمارت یا واقعے کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہاں جنم لینے والی دو ہستیوں نوح ناروی اور مقبول مصنف ابنِ صفی کی وجہ سے ہے۔ یہ قصبہ پہلے ضلع الٰہ آباد کا حصہ تھا مگر اب اسے اتر پردیش کے ضلع کوشمبی کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ استاذالاساتذہ نوح ناروی نے اپنے کئی شعروں میں نارا کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

قصبہ نارا ضلع الٰہ آباد

یہ پتا ہے وطن کا رکھنا یاد

ایک اور جگہ کسی کو پتا شعری صورت میں بیان کیا:

جو آنا ہے ان کو تو آئیں وہ اے نوح، وہ منزل طرف راستہ کچھ نہ پوچھیں

چلیں ریل میں اور پہنچیں سراتھو سے نو میل دکھن ہے نارا

نارا جیسے مردم خیز علاقے میں ابنِ صفی کے اجداد پشت با پشت سے آباد تھے۔ ابنِ صفی کے آبا و اجداد کائستھ (Kayastha) سے مسلمان ہوئے۔ کائستھ جاتی کے لوگ زمانہ قدیم سے حساب دان، ٹکھاری اور ریاستی امور کے ماہر گنے جاتے ہیں۔ نارا میں مقیم کائستھ قبائل میں سے ایک قبیلہ "ورما" کے سربراہ اور راجہ وشیشر دیال سنگھ نے اسلام قبول کر کے بابا عبدالنبی کا نام اختیار کیا۔ ابنِ صفی انہی کی اولاد میں سے تھے۔ آج بھی نارا قصبے میں بابا عبدالنبی کے مقبرے کے آثار موجود ہیں۔ ابنِ صفی خود نارا کے متعلق بیان کرتے ہیں:

"وہ ایک بھرپورا قصبہ تھا جہاں میں نے آنکھیں کھولیں۔ خوش حال زمین داروں کی بستی تھی۔ ہر طرف فرصت ہی فرصت نظر آتی تاش، شطرنج اور گنجفے کی

بازیاں تھیں۔ کچھ لوگ میر شکار سے ہی جیالاتے۔ بعض گھرانے ایسے بھی تھے
جہاں زیادہ تر علم و ادب کے چرچے رہتے۔"[1]

ددھیال

ابن صفی کا ددھیالی خاندان انتہائی دیانت دار، نیک اور صاحبان علم میں شمار ہوتا تھا۔ بنیادی پیشہ زمین داری تھا مگر ان کے بزرگ دینی و دنیوی تعلیم حاصل کر کے مختلف ملازمتیں اختیار کرتے رہے تھے۔ ابن صفی کے دادا مولوی عبدالفتاح زمین داری کے ساتھ ساتھ ناصین کے ایک سکول میں مدرس تھے۔ بعد ازاں وہ ریاست گوالیار میں اسی شعبہ سے منسلک رہے۔ وہ ایک ذی علم شخص تھے جنھیں مطالعے کا بھی شوق تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے ان کا ذاتی کتب خانہ خاصا وسیع تھا۔ بقول ابن صفی "ہمارے گھر کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے۔"[2] ابن صفی کے والد خود بھی اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل تھے۔ ابن صفی کی چھوٹی ہمشیرہ محترمہ عذرا لطیف (پیدائشی نام عذرا ریحانہ) نے ابن صفی پر ایک مضمون بعنوان "میرے بھائی جان" لکھا جس میں وہ اپنے والد کے دادا حکیم عبدالحلیم کے بارے میں بتاتی ہیں:

> "میرے والد کے دادا بھی بہت تجربہ کار حکیم تھے۔ ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ ایک خاتون بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں تو انھیں دیکھتے ہی دادا نے کہا تم سبزی کاٹ رہی ہو حالاں کہ تم مرنے والی ہو۔ وہ خاتون یہ سن کر ہنس پڑیں اور سمجھیں کہ بڑے میاں کا دماغ چل گیا ہے۔ لیکن حقیقتاً چند گھنٹے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ انھیں جادوگر سمجھنے لگے تھے۔"[3]

ننھیال

ابن صفی کے ننھیال میں صاحبان علم و فضل کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ یہ خاندان حکیموں کے خاندان کے نام سے مشہور رہا۔ ان کے ننھیالی بزرگ حکیم احسان علی اور حکیم رحمان علی یونانی طب میں بڑا اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی دو فارسی تصانیف "طب احسانی" اور "طب رحمانی" ہندوستان کے طول و عرض میں حکمت کے نصاب میں شامل تھیں۔[4] حکمت کے ساتھ ساتھ حکیم رحمان علی ایک عالم بے بدل اور ادب کی معتبر ہستی تھے۔ شاگرد داغ دہلوی، نوح ناروی ابن صفی کے رشتے کے ماموں لگتے تھے۔ ابن صفی کے نانا سلیم احمد صاحب ایک مشہور وکیل تھے۔

ابن صفی کے والد صفی اللہ ایک صاحب علم شخص تھے۔ گو انھوں نے صرف میٹرک کیا تھا، تاہم اردو اور انگریزی زبان میں اس قدر مہارت تھی کہ بڑے بڑے سی ایس پی افسروں کی انگریزی درست کر دیا کرتے تھے۔ ان کی انگریزی اور اردو کا خط شاندار تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ریکارڈ یا اندازہ نہیں۔ انھوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سید وزیر علی اینڈ کو Syed Wazir Ali & Co [۵] میں ملازمت اختیار کی۔ یہ کمپنی برطانوی فوج کو سامان رسد فراہم کرتی تھی۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں انھیں ہندوستان کے بہت سے شہروں میں رہنا پڑا جن میں الہ آباد، ڈیرہ دون، دیولالی، دارجلنگ اور گونڈہ شامل ہیں۔ صفی اللہ اپنے سب بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کی اپنے بچوں سے محبت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے، جو نذر الطیف نے حنذ کردہ مضمون میں تحریر کیا ہے:

"بمبئی کے قریب ایک چھوٹا سا شہر دیولالی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں ہمارے والد بغرض ملازمت دیولالی میں مقیم تھے۔ انھی دنوں مجھ سے بڑی اور بھائی جان سے چھوٹی بہن نفیسہ بیمار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے تبدیلیٔ آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ جب ابا کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ فوراً آ کر ہمیں اپنے ساتھ دیولالی لے گئے۔" [۶]

ابن صفی کے دیرینہ دوست شاہد منصور اپنے مضمون "باتیں اور یادیں" میں صفی اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابن صفی نے اپنے نام کے لاحقے سے مرحوم (صفی اللہ) کو زندہ جاوید کر دیا ہے بلکہ ابن صفی کے بے شمار قارئین اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے شجرہ نسب میں والدیت کے خانے میں اپنے باپ کی جگہ صفی اللہ مرحوم کا نام لکھیں۔ صفی اللہ مرحوم بڑی آن بان اور جاہ و جلال والے بزرگ تھے۔ رعب اتنا تھا کہ کوئی اجنبی انھیں دیکھتا تو بات کرنے کی جرأت نہ کرتا مگر یہ قریب آنے پر ہی محسوس ہوتا تھا کہ محبت و شفقت کا کتنا بڑا سمندر ہے جو ان کے اندر موجزن ہے۔ میرے حال پر وہ بہت کرم فرماتے تھے اور مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ گورا رنگ، روشن آنکھیں، سفید بال، سفید داڑھی اور سفید ہی لباس۔ صفی اللہ مرحوم کا جب بھی تصور کرتا ہوں تو مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا ایک جملہ یاد آ جاتا ہے جو

انھوں نے حکیم آغا جان عیش کے بارے میں لکھا تھا کہ حکیم صاحب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو۔ صفی اللہ مرحوم کے بارے میں کچھ ایسا ہی تصور ذہن میں آتا ہے، مگر چنبیلی کے بجائے موتیے کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ نہ معلوم کیوں؟ صفی اللہ مرحوم نے زمین داری بھی کی اور ملازمت بھی۔ انھوں نے بڑی کامیاب زندگی گزاری۔ اردو کے کلاسیکی ادب خصوصاً طلسم ہوشربا اور بوستان خیال سے انھیں گہری دل چسپی تھی۔'' [۷]

صفی اللہ بڑے فخریہ انداز سے بتاتے تھے کہ ہم پیدائشی یا اتفاقی مسلمان نہیں بلکہ اختیاری مسلمان ہیں۔ ہمارے آباو اجداد نے اسلام کو سوچ سمجھ کر اپنایا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ نقل کرتا چلوں جو ابن صفی کے قریبی دوست شاہد منصور نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے:

"ایک دن ہم بھی لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کچھ دوسرے صاحبان بھی تھے۔ یوں تو آل رسول ﷺ سے محبت ایمان کا جزو ہے مگر ایک سید صاحب اپنی سیادت کا بڑے زور شور سے ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اور آل رسول ﷺ ہونے پر فخر بلکہ تکبر کر رہے تھے کہ میں بول پڑا کہ اسلامی تعلیم میں حسب نسب پر فخر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور پھر صفی اللہ مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک فقرہ پھینکا کہ چچا! آل رسول ﷺ تو آپ بھی ہیں۔ مرحوم کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں، کانوں کو ہاتھ لگاتے اور توبہ توبہ کرتے ہوئے بولے نہیں نہیں ہمارا تعلق ورما کاستھوں سے ہے اور ہمارے آباو اجداد تو مسلم ہندو تھے۔'' [۹]

جناب صفی اللہ خاموش رہ کر خود کو آل رسول ﷺ بھی کہلوا سکتے تھے مگر انھوں نے خود سچائی بیان کر کے اپنے پختہ کردار کا ثبوت دیا۔ اتفاقاً صفی اللہ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل ہی اپنی ملازمت کے سلسلے میں کراچی تشریف لا چکے تھے۔ یہاں بھی ان کی ملازمت وزیر علی انڈسٹریز میں رہی جہاں سے وہ ۱۹۶۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ ان کی وفات جون ۱۹۹۸ء میں کراچی میں ہوئی اور وہ پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ پکی قبر نہ ہونے کے باعث اب ان کی قبر کے نشان گم ہو چکے ہیں۔

والدہ

نذیرہ بی بی اپنے دست خط ان ہی ہجوں کے ساتھ کرتی تھیں مگر نام کا تلفظ "نذیرا" کیا کرتی تھیں۔ ان کا سال پیدائش ۱۹۰۰ تھا۔ یوں وہ بیسویں صدی کے ساتھ دنیا میں وارد ہوئیں۔ نذیرہ بی بی نہایت صالح اور مذہبی خاتون تھیں۔ نرم و نازک اور خوب صورت شخصیت کی مالک تھیں۔ رنگ سرخ و سپید، آواز انتہائی باریک اور لہجہ بے حد نرم تھا۔ ان کا تعلق انتہائی علم دوست اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ خود نذیرہ بی بی کو مطالعے کا از حد شوق تھا اور وہ مذہبی رسالوں کے علاوہ خواتین کے مشہور جرائد مثلاً "عصمت" اور "بانو" وغیرہ کی خریدار تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد بھی "حور" اور "زیب النسا" جیسے جرائد ان کے مطالعے میں رہتے تھے۔ ابن صفی کی والدہ نے اپنے بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھا۔ ابن صفی کی بہتر تعلیم کے لیے وہ نارا سے الٰہ آباد منتقل ہوئیں جو اس زمانے میں بڑا ہی کٹھن کام تھا۔ مگر اپنی اولاد کے لیے انھوں نے یہ تکلیف بھی اٹھائی۔ ابن صفی کی ہمشیرہ اپنے مضمون "میرے بھائی جان" میں اپنی والدہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> "ہماری اماں بڑی باحوصلہ خاتون تھیں۔ والد صاحب ملازمت کے سلسلے میں کبھی ایک جگہ جم کر رہ نہ سکے یہ اماں جان ہی کی ہمت تھی کہ انھوں نے بھائی جان (ابن صفی) کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا اور تنہا ماں باپ دونوں کے فرائض سرانجام دیے[۹]۔"

ابن صفی اپنی والدہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس ضمن میں نذرا لطیف بتاتی ہیں:

> "بھائی جان ہمیشہ یہی کہتے: میں جو کچھ بھی ہوں اپنی ماں کی جوتیوں کے طفیل ہوں۔ اور ایک بار میں ان کے اس جملے کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ چکی ہوں۔ اماں میرے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ بھائی جان مصروفیت کی وجہ سے ان سے پندرہ دن ملنے نہ آ سکے۔ اماں نے ناراضگی سے کہا "ہاں بھئی! تم ابن صفی ہو، پوری دنیا میں تمھاری شہرت ہے"۔ اماں کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی بھائی جان نے اماں کی چپل اٹھائی اور اپنے سر پر رکھ لی۔ یہ ماں سے ان کی بے پناہ محبت کا مظاہرہ تھا جو میں نے دیکھا۔"[۱۰]

ستر کی دہائی کے اوائل میں ایک حادثے کے بعد چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں پھر بھی ہم اقبال

حسین مرحوم کی سفارش پر ان کے ایک ساتھی ڈاکٹر سراج نے نذیرہ بی بی کا ایک انجکشن سے علاج کیا اور وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہوگئیں۔ زندگی کی ۸۹ بہاریں دیکھ کر ۱۸ رجون ۱۹۷۸ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئیں۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

سن ۱۹۲۸ء، اپریل کے مہینے میں صفی اللہ اور نذیرہ بی بی کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے کی نعمت سے سرفراز کیا۔ والدین نے اس بچے کا نام اسرار احمد رکھا۔ یہی بچہ بعد میں اپنے قلمی نام ابن صفی سے اتنا مشہور ہوا کہ اس کا اصلی نام اپنے قلمی نام کی روشنی میں گم ہو گیا۔ ابن صفی اپنی پیدائش کے بارے میں بتاتے ہیں:

> "اپریل ۱۹۲۸ء کی کوئی تاریخ تھی اور جمعے کا دن شام کے دھندلکوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی۔" [۱۱]

گھر کا ماحول دینی و علمی تھا۔ دادا اور والد دونوں صاحب مطالعہ شخصیات تھیں۔ لہٰذا گھر میں بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ قدیم ناول اور داستانیں کثیر تعداد میں میسر تھیں۔ والدہ خود بھی مختلف رسائل کا مطالعہ کرتی تھیں لہٰذا چھوٹی سی عمر میں انھوں نے مطالعہ کی عادت اپنا لی۔ سات آٹھ سال کے تھے جب طلسم ہوشربا کی ساری جلدیں پڑھ ڈالیں۔ اس مطالعے نے ان کے ذہن پر بہت اثر ڈالا۔ اس موضوع پر خود روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> "والد صاحب کو مطالعے سے دلچسپی تھی لہٰذا گھر میں ناولوں اور قدیم داستانوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے اجازت نہیں تھی کہ ان کو ہاتھ بھی لگاؤں۔ بس چوری چھپے کوئی کتاب کھسکائی اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ باہر کھیلنے جا رہا ہوں چھت پر ہو لیا۔ سارا سارا دن گزر جاتا۔ آخر ایک دن پکڑا گیا اور والدین میں ٹھن گئی۔ لیکن فیصلہ میرے ہی حق میں ہوا۔ والدہ نے کہا: "ان بچوں سے تو بہتر ہی ہے جو دن بھر گلیوں میں گلی ڈنڈا یا گولیاں کھیلتے پھرتے ہیں۔ پھر اس دن سے کوئی روک ٹوک نہ رہی اور میں داستانوں میں ڈوب رہا۔" [۱۲]

بہن بھائی

ابن صفی کے علاوہ ان کے والدین کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک بیٹا اور تین بیٹیوں کی نعمت سے

سرفراز کیا۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

☆ **خورشید خاتون:** ابن صفی کی سب سے بڑی بہن تھیں۔ تاریخ پیدائش یا وفات کا کسی تحریر میں ذکر نہیں ملتا۔ تاہم نذر الطیف کے مضمون میں ان کی بیٹی کا ذکر ہے:

"۱۹۵۲ء میں ابا ہمیں پاکستان لانے کے لیے الہ آباد آئے۔ ان ہی دنوں بڑی بہن جنھیں ہم سب بہن بھائی بڑی آپا جان کہتے تھے، کی بیٹی ہمارے پاس تھی جب کہ اس کی اصل رہائش گاہ ونجگی میں تھی۔" [۱۳]

☆ **ایجاز احمد:** ابن صفی کے چھوٹے بھائی تھے کم عمری میں انتقال ہوا۔

☆ **نظیرو بی بی:** ابن صفی سے چھوٹی تھیں کم عمری میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

☆ **نذر زہرہ ریحانہ:** بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور سب سے طویل عمر پائی۔ نذر زہرہ ریحانہ کو پیار سے گھر میں بلاغت کہا جاتا تھا۔ آپ ۱۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی لطیف احمد صدیقی سے ہوئی۔ [۱۴] ۲۶ اگست ۲۰۰۵ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

تعلیم و تربیت

ابن صفی نے پانچویں جماعت تک تعلیم نارہ ہی میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے ان کے والدین خصوصاً والدہ کو الہ آباد منتقل ہونا پڑا۔ الہ آباد کے مشہور تعلیمی ادارے دیانند آریا ویدک (DAV) سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ [۱۵] اس تاریخی ادارے میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ایونگ کرسچین کالج (Ewing Christian College) سے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ [۱۶] یہ تاریخی ادارہ آج بھی ایک مستند اور اعلیٰ معیار کے حامل ادارے کے طور پر مشہور ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۰۲ء میں قائم کیا گیا۔ یہ الہ آباد یونیورسٹی سے الحاق یافتہ پہلا کالج تھا جہاں ۱۹۳۰ء تک پوسٹ گریجویشن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاہم ۱۹۲۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے متعلق ایک ایکٹ پاس ہوا اور یہاں ایف اے تک تعلیم دی جانے لگی۔ [۱۷] یہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ابن صفی نے ۱۹۴۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے ان کی ادبی و ذہنی آبیاری میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ تاہم قیام پاکستان کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور فسادات آہستہ آہستہ پورے بھارت میں پھیلنا

شروع ہو گئے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی بھی ان ہنگاموں کی نذر ہوئی اور بزرگوں نے ابن صفی کو یونیورسٹی جانے سے روک دیا۔[۱۸] حالات پرسکون ہونے میں ایک قیمتی برس گزر گیا اور ۱۹۴۸ء میں جب تقسیم ہند کا ہنگامہ ختم ہوا تو ابن صفی نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے آگرہ یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں دوبارہ داخلہ نہ لینے کی دو وجوہات تھیں۔ اول اب ان کے تمام ساتھی ایک سال سینئر ہو چکے تھے۔ دوم الہ آباد یونیورسٹی میں طالب علم پرائیویٹ داخلہ یا امتحان نہیں دے سکتے تھے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں کسی جامعہ میں پرائیویٹ امیدواروں کو داخلہ نہیں دیا جاتا تھا سوائے آگرہ یونیورسٹی کے اور وہ بھی صرف اس شرط پر پرائیویٹ امیدوار کو بی اے کا امتحان دینے کی اجازت دیتی تھی کہ اس کے پاس بطور مدرس دو سال کا تجربہ ہو۔ ابن صفی نے یہ شرط پوری کرنے کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی۔[۱۹] ابن صفی نے اپنے ایک مضمون "بقلم خود" مشمولہ الف لیلیٰ ڈائجسٹ الہ آباد یونیورسٹی میں گزرے ہوئے وقت کو اس طرح یاد کیا ہے:

> "۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے لیکچرز نے ذہنی نشوونما کے نئے باب کھولے۔۔ فکر و نظر کی تہذیب کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ مدت بہت قلیل تھی۔ ۴۷ء کے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی چھرا زنی کی ایک واردات ہو گئی اور بزرگوں نے میرا یونیورسٹی جانا بند کر دیا۔ پھر دوسرے سال دوبارہ داخلے کی ہمت اس لیے نہیں پڑی تھی کہ میرے ساتھی تو تھرڈ ایئر میں پہنچ گئے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدواروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یوپی (اترپردیش) میں صرف آگرہ یونیورسٹی ایسے طلبا کا واحد سہارا تھی، لیکن شرط یہ تھی کہ امیدوار کو کسی ہائی سکول میں معلمی کا دو سالہ تجربہ ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا چلو یہی سہی۔۔۔۔۔ دو سال تک لوگ "ماسٹر صاحب" ہی تو کہیں گے۔۔۔۔ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر احساس کمتری کا شکار تو نہ ہونا پڑے گا۔۔۔۔ لہٰذا بی اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا تھا۔"[۲۰]

ملازمت

ابن صفی نے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے لیے یادگار حسینی سکول میں پڑھایا۔ وہاں آپ کا

شمار مقبول اور قابل اساتذہ میں ہوتا تھا۔ شکیل جمالی کے مضمون کے درج ذیل اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ تدریس کا یہ سلسلہ پاکستان ہجرت تک جاری رہا:

"ابن صفی کی تہہ دار شخصیت، مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں کی حامل تھی۔ شاعر، ادیب اور طنز نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر درس و تدریس کا بھی خاص ملکہ تھا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک یادگار حسینی سکول میں ٹیچر تھے۔"[۴۱]

ابن صفی اتنے مقبول استاد تھے کہ جب ان کی رحلت کی خبر یادگار حسینی سکول پہنچی (اب یہ ادارہ یادگار حسینی انٹر کالج بن چکا ہے) تو ایک تعزیتی جلسے کے بعد اپنے سابق مدرس ابن صفی کے سوگ میں ادارہ بند کر دیا گیا۔[۴۲] پاکستان آ کر ابن صفی نے کوئی ملازمت نہیں کی۔ پہلے لیاقت آباد (پرانا نام: لالوکھیت) میں اپنا ادارہ "اسرار پبلی کیشنز" کے نام سے قائم کیا بعد ازاں اسے فردوس کالونی ناظم آباد میں منتقل کر دیا جہاں ان کی وفات تک یہ دفتر قائم رہا۔

شادی و اولاد

ابن صفی نے تین نکاح کیے۔ پہلی شادی فرحت خاتون سے ہوئی۔ یہ پاکستان ہجرت سے پہلے کی بات ہے۔ فرحت خاتون کا انتقال ٹی بی کے مرض سے ہوا۔ دوسری شادی فرحت خاتون کی سگی خالہ زاد بہن ام سلمیٰ خاتون سے ہوئی۔ ابن صفی اور ام سلمیٰ خاتون ۱۹۵۳ء میں زندگی بھر کے ہم سفر بنے۔[۴۳] لکھنؤ اور الہ آباد کا یہ ملاپ پاکستان کے شہر راولپنڈی میں ہوا۔ ام سلمیٰ خاتون ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو محمد امین احسن اور ریاض فاطمہ کے ہاں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سلطان پور میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (DSP) تھے۔ ام سلمیٰ خاتون کا تعلق لکھنؤ کے ایک صاحب علم و حیثیت خانوادے سے تھا۔ ام سلمیٰ کے دادا محمد احسن وحشی، ایک مشہور شاعر تھے، جو مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کے مریدین میں سے تھے۔ آپ کے ایک تایا مولانا نجم احسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفا میں سے تھے۔[۴۴] ام سلمیٰ کے بھائی مکین احسن کلیم (۱۹۲۳ء۔۱۹۷۹ء) روزنامہ مشرق لاہور کے چیف ایڈیٹر تھے۔[۴۵] آپ کی بہن صفیہ صدیقی ایک افسانہ و ناول نگار تھیں۔[۴۶] ام سلمیٰ خاتون کے خانوادے اور ادبی ذوق کے متعلق فرزند ابن صفی لکھتے ہیں:

"ہماری والدہ کا تعلق گرام کے ایک بہت علمی ادبی گھرانے سے تھا۔ ہمارے نانا جناب امین احسن مرحوم سلطان پور میں پولیس کے ڈی ایس پی تھے۔ ان

کے یہاں علمی ادبی محفلیں سجتی رہا کرتی تھیں جنھیں بچپن سے امی نے دیکھا۔
بڑے بھائی کمیں احسن کلیم صاحب شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ ان کے جگری
دوستوں میں مجروح سلطان پوری صاحب شامل تھے اور جب ترقی پسندوں کی
پکڑ دھکڑ انگریزوں کے دور میں شروع ہوئی تھی تو مجروح ہمارے نانا جی کے
یہاں روپوش رہے تھے۔ سن انیس سو ستاسی میں ہمارے چچا ڈاکٹر منظور الدین
احمد صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، کے یہاں ایک نشست میں مجروح
امی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کہ کبھی گودوں میں کھلایا تھا اب بچوں کے
ساتھ مل رہے ہیں۔ امی کے تایا مولانا نجم احسن نگرامی صاحب دیوان شاعر،
وکیل اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے خلیفہ مجاز صحبت تھے۔ جگر مراد
آبادی صاحب بھی ان کے معتقد تھے اور جب پاکستان آئے ان کے پاس
قیام و حاضری دی۔ ہماری خالہ صفیہ صدیقی صاحبہ افسانہ نگار تھیں اور ان کے
ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہماری نانی مرحومہ ریاض فاطمہ
بیگم بھی شاعرہ تھیں۔ اور امی کی پھوپھی محترمہ میمونہ خاتون زینت لکھنوی بھی
شاعرہ تھیں۔ اب ایسے خانوادے میں پیدائش اور پرورش کے بعد کوئی کس
طرح ادبی ماحول سے الگ رہ سکتا ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں ادب گھٹی میں پڑا
ہونا۔ ہمارے چچا مرحوم جناب غلام کبریا صاحب، جو [illegible] کمشنر سے وابستہ
رہے اور کئی کتابوں کے ہندی تراجم میں شامل تھے، کہا کرتے تھے کہ کسی بھی ادبی
شاہکار پر ہماری والدہ کا تبصرہ اور تنقید اس پائے کی ہوتی تھی کہ اسے اشاعت
کے لیے قبول کیا جا سکتا تھا۔ ان کی رائے صائب ہوا کرتی تھی۔ امی، ابو کے
ساتھ بھی ان کے ناولوں پر تبصرے میں شامل رہتی تھیں۔ ابو انھیں اپنی پہلی قاری
کہتے تھے کیوں کہ وہ مسودے سے ناول پڑھ لیا کرتی تھیں۔ امی کے آخری دور
میں ان کی پسندیدہ مصنفہ محترمہ بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری تھیں۔ ہم سمجھ
سکتے ہیں کہ ایسا کیوں تھا۔ ان کی کتاب "ہم سفر" پڑھتے ہوئے ہمیں بھی ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری والدہ ہی کی زندگی کا ذکر ہو۔ وہی اقدار اور خاندان کو

ساتھ لے کر چلنا اور والدہ محترمہ کو تمام گھریلو پریشانیوں سے دور رکھنا۔"[۴۷]

محترمہ ام سلمیٰ خاتون کا انتقال ۱۲ رجون ۲۰۰۳ء کو کراچی میں ہوا۔ وادیٔ حسین کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ابن صفی کی تیسری شادی فرحت آرا نامی ایک خاتون سے ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ اس شادی سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ فرحت آرا ایک عرصہ تک خواتین کے رسالے "آنچل" کی مدیرہ رہیں اور ۲۰۱۰ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابن صفی اور ام سلمیٰ خاتون کو چار بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ اولاد کی تفصیل کچھ یوں ہے[۴۸]:

☆**نزہت افروز:** ابن صفی کی سب سے بڑی صاحب زادی ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ آج کل کراچی میں قیام ہے۔

☆**ڈاکٹر ایثار احمد صفی:** آپ ابن صفی کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ آپ ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر اور اختر آئی اسپتال میں شعبہ قلب وذیابیطس کے صدر تھے۔ ۲۰۰۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

☆**ابرار احمد:** ۱۹۵۷ء میں پیدا ہونے والے ابرار احمد پیشے کے لحاظ سے مکینیکل انجینئر ہیں اور آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔

☆**ثروت اسرار:** ۱۹۵۹ء میں پیدا ہوئیں۔ آج کل لندن میں مقیم ہیں۔

☆**احمد صفی:** آپ ۱۹۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مکینیکل انجینئرنگ میں امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آج کل لاہور میں قیام پذیر ہیں۔

☆**افتخار احمد صفی:** سال پیدائش ۱۹۶۳ء۔ الیکٹریکل انجینئر ہیں اور آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔

☆**محسنہ صفی:** ابن صفی کی سب سے چھوٹی صاحب زادی ۱۹۶۷ء میں پیدا ہوئیں۔ کراچی میں سکونت رکھتی ہیں۔

ابن صفی کے بیٹوں اور ایک صاحب زادی کے ناموں میں ان کے دادا کا نام "صفی" جڑا ہے۔ اس کی بڑی دلچسپ کہانی احمد صفی صاحب کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم بھائیوں کے ناموں کی کہانی بھی دلچسپ ہے سب کے نام اسرار احمد کے قافیے پر رکھے گئے۔ ایثار احمد، ابرار احمد، اظہار احمد (خاکسار) اور افتخار احمد۔

دادا صفی اللہ صاحب سے روایت ہے کہ جب وہ مجھے پہلی جماعت میں داخلے
کے لیے اشرف سکول لے کر گئے اور استانی صاحبہ نے رجسٹر میں لکھنے سے قبل
مجھ سے میرا نام دریافت کیا تو میں نے احمد صفی بتایا۔ انھوں نے دادا سے پوچھا تو
دادا نے کہا صاحب زادے بتا رہے ہیں تو درست ہی ہوگا۔ شاید دل ہی دل
میں خوش ہوئے کہ بیٹے نے تو قلمی نام ہی رکھا تھا پوتے نے ان کے نام کو اپنے
نام کا حصہ بنا لیا۔ گھر آ کر اعلان کر دیا کہ اب سے حضرت کا نام احمد صفی ہی ہوگا۔
یوں انتشار ختم ہوا۔ میرے بعد افتخار صاحب کے داخلے کی باری چار سال بعد آئی
تو ان کا نام افتخار احمد صفی لکھوا دیا گیا۔ ابرار بھائی جب روم میں تھے تو مختلف
مضامین پر اپنا نام ابرار احمد صفی لکھنے لگے۔ جنگ اخبار کے نامہ نگار کے طور پر
انھوں نے یہی نام استعمال کیا۔ پاکستان واپسی پر باقاعدہ اخبار میں اشتہار
دے کر اپنا نام تبدیل کیا اور پکے طور پر ابرار احمد صفی ہو گئے۔ ابرار بھائی اپنے نام
کے ساتھ صفی نہیں لگاتے۔ اگر کبھی کچھ لکھتے ہیں تو ابرار صفی کے نام سے لکھتے ہیں
مگر آفیشل نام ابرار احمد ہی ہے۔ یوں میرا نام ادھورا سا لگتا ہے۔ لیکن اب ہم
سب بھائیوں کی اولادوں کے نام میں صفی ضرور شامل ہے۔ یوں دادا کا صفی
خانوادہ شروع ہوا۔"[۴۹]

اس واقعے سے ابن صفی کے گھرانے میں جہاں بچوں کو دی جانے والی جائز آزادی کا پتا چلتا ہے، وہیں صفی اللہ اور ابن صفی کا اپنے بچوں پر اعتماد اور ان سے گہرا پیار بھی جھلکتا ہے۔ چھوٹے سے بچے نے اپنا نام تبدیل کر دیا، دادا نے بھی اس فیصلے پر صاد کیا اور والد نے بھی یہ دیکھا کہ نام تبدیل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تو انھوں نے بھی بچے کے اعتماد پر اعتماد ظاہر کیا۔ یہ واقعہ ابن صفی کے اپنے والد سے احترام اور اپنے بچوں سے گہری نسبت اور ان میں اعتماد جگانے کی کوشش کا مظہر ہے۔

وفات

ابن صفی دو بار شدید بیمار ہوئے۔ پہلی بار ۱۹۶۱ء کے اوائل میں جب ان پر "شیزوفرینیا Schizophrenia" کا حملہ ہوا۔ اس بیماری کو اردو میں انفصام کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ امریکی ادارے نیشنل ادارہ برائے ذہنی صحت National Institute of Mental

Health کی ویب سائٹ پر دی گئی تعریف کے مطابق:

"شیزوفرینیا یا انفصام ایک ایسا دماغی مرض ہے جو مریض کے سوچنے، محسوس کرنے اور اس کے رویے میں بہت سی ناہمواریوں کا سبب بنتا ہے۔ انفصام ایک ناکارہ کر دینے والی ذہنی کیفیت ہے۔ اس مرض میں مریض کا رویہ تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو ناموجود صدائیں یا دکھائی دینے لگتے ہیں، اوہام پیدا ہو جاتے ہیں اور گفتگو میں انتشار اور بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تمام عوامل مل کر مریض کو معاشرے سے الگ تھلگ کر دیتے ہیں اور اس کے لیے دوسروں سے رابطہ قائم رکھنا دشوار ہوتا چلا جاتا ہے۔ انفصام میں مبتلا شخص کے لیے حقیقی اور خیالی دنیا میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ منطقی انداز میں سوچ بچار اور تجزیہ نہیں کر پاتا۔ وہ معمول کے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پاتا اور اپنے ارد گرد کی صورت حال اور معاشرے کے بارے میں اس کا رویہ معمول کے مطابق نہیں رہتا اور یوں روز بروز وہ معاشرے سے الگ تھلگ ہوتا چلا جاتا ہے۔"[۳۰]

اس بیماری نے انھیں قریباً تین برس تک محصور رکھا۔ مختلف ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہے مگر انھیں حکیم محمد اقبال حسین (ایم اے) کے علاج سے شفا ملی۔ اپنی بیماری سے قبل عمران سیریز کے سلسلے کی ایک کہانی کے ابتدائی دو حصے (دلچسپ حادثہ اور بے آواز سیارہ) لکھ چکے تھے۔ تیسرا حصہ (ڈیڑھ متوالے) لکھنے سے قبل ان پر شیزوفرینیا کا شدید حملہ ہوا۔ یہ تمام روداد انھوں نے اپنی کتاب ڈیڑھ متوالے کے دیباچے میں خود بیان کی ہے:

"کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے
پھر چھلکنے لگے سبو آؤ

آج پھر تین سال بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ آپ کی دعاؤں نے ہی اس قابل کیا کہ پھر خدمت کر سکوں۔ میرا سینہ فخر سے تن جاتا ہے جب یہ سوچتا ہوں کہ میری صحت یابی کے لیے مسجدوں، مندروں، کلیساؤں اور گردواروں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ مجھ تک میرے پڑھنے والوں کے

خطوط بھی پہنچتے تھے لیکن جواب دینے سے قطعی معذور تھا۔ بس کڑھ کر رہ جاتا
تھا۔۔۔۔ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ توقع نہیں تھی کہ پھر لکھنے کے قابل
ہو سکوں گا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کبھی کچھ لکھا ہی نہ ہو۔ بیماری کی ابتدا
نروس بریک ڈاؤن سے ہوئی تھی۔ پھر یادداشت پر اثر پڑا اور اس کے بعد مستقل
طور پر ہر دوسرے دن شدید قسم کے تشنجی دورے پڑتے رہے۔"[۳۱]

۱۹۶۳ء میں اس بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد انھوں نے پھر اسی انداز سے لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ ۱۹۷۹ء کے اواخر میں ان کے پیٹ میں شدید درد اٹھنا شروع ہوا۔ معائنے کے بعد انھیں لبلبے کا کینسر تشخیص ہوا۔ ان کے معالج ڈاکٹر سعید اختر زیدی اور ڈاکٹر قمر الدین صدیقی تھے۔ ان کے علاوہ وہ ڈاکٹر ایس ایم رب (بانی رب میڈیکل سینٹر) اور کینسر کے علاج کے ماہر ڈاکٹر سید حسن منظور زیدی کے زیر علاج بھی رہے۔[۳۲] تاہم اس بار وہ اس جان لیوا بیماری سے جانبر نہ ہو سکے اور یوں ۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء بمطابق ۱۴ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ ہجری کو اردو میں جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ، مقبول ترین قلم کار اور عوامی ادیب ہم سے رخصت ہو گئے:

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

ابن صفی کے صاحب زادے جناب احمد صفی نے بڑے ہی پُر اثر انداز میں اس حادثۂ جانکاہ کو بیان کیا ہے:

"۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء۔۔۔ یہ وہ دن ہے جس نے مجھے میرے اہل خاندان
سمیت تمام سہاروں سے بے نیاز کر دیا۔ اس دن وہ حادثہ پیش آیا جس کے بعد
ہمارے لیے مزید کسی اندوہناک حادثے کا تصور باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ وہ دن تھا
کہ جس دن نہ صرف آٹھ دس افراد پر مشتمل کنبے کا سربراہ رخصت ہو گیا بلکہ
برصغیر کے کروڑوں افراد کا مرکز توجہ اس دنیا سے انتقال کر گیا۔ بک اسٹالوں پر
پڑنے والی کروڑوں منتظر نگاہوں کو آنسوؤں کا تحفہ دے کر اسرار احمد جنھیں ایک
عالم ابن صفی کے نام سے جانتا ہے راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔"[۳۳]

☆☆☆☆

ادبی زندگی

ابن صفی کی ادبی زندگی کا جائزہ لینے سے قبل دو اہم موضوعات پر بحث ضروری ہے، ایک ادب عالیہ اور مقبول عام ادب کی بحث اور موثر انداز کی اہمیت اور دوسرے اردو میں جاسوسی ادب کی تاریخ تا کہ یہ بات واضح ہو سکے کہ اردو میں جاسوسی ادب پر کب کام شروع ہوا تھا؟ اور کس نے کیا اور طبع زاد ناول کس نے لکھے تب کہیں ابن صفی کی خدمات اور ادبی زندگی کا پس منظر مکمل طور پر ہمارے سامنے آ سکے۔

ادب، ادب عالیہ اور مقبول عام ادب

ادب کیا ہے؟ انسان کی زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ ادب عالیہ کیا ہے اور مقبول عام ادب کیا ہے؟ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن میں ابتدائی دو سوالات تو زمانہ قدیم سے ہی جواب طلب ہیں اور تیسرا لگ بھگ چالیس کی دہائی سے (جب سے Popular Literature کی اصطلاح رائج ہوئی ہے، اس وقت سے) ذہنوں میں گونج رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ جناب ابن صفی کی ادبی زندگی پر بات کی جائے یہ ضروری ہے کہ پہلے ادب، ادب عالیہ اور مقبول عام ادب کی بنیادی تعریفات اور ان میں فرق کا جائزہ لے لیا جائے کہ ابن صفی کی تخلیقات کے بعد مقبول عام ادب ایک بالکل نئی زندگی پا گیا اور اپنی مقبولیت کے باعث ادب عالیہ سے ایک قدم آگے نکل گیا۔

ادب:

ارسطو اپنی تخلیق "بوطیقا" میں ادب کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ ادب زبان کے ذریعے نمائندگی کرنے والا ایک فن ہے جس کا کوئی نام نہیں۔ ادب کی ایک تعریف یوں بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ بلا تفریق علم و فن ہر قسم کی تحریر ادب ہے جیسا کہ Literature کے معنوں سے واضح ہے جس کے لاطینی معنی "لکھا ہوا حرف" ہیں۔ ادب میں اگرچہ علم کا معنوی پہلو موجود ہے لیکن تہذیب و تادیب کی مزید معنوی سطحوں کے تلازم میں یہ اصطلاح فن کو بھی محصور کرتی ہے اور اس طرح شعر و غنا اور قصص و

حکایات کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، منطق، خطابت، طب اور حکمت بھی ادب کے زمرے میں شامل ہیں۔ ہر دور کا ادب اپنے عصر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یعنی اس زمانے کی معاشی و سماجی زندگی ادب پر بھی اسی طرح اپنا اثر ڈالتی ہے، جس طرح وہ کسی فرد واحد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک ادیب یا شاعر جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ اگرچہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے مجبور کرنے پر ہی لکھتا ہے مگر یہ کسا ہٹ بھی خارجی حالات و واقعات کا نتیجہ ہوتی ہے جن کو مجموعی طور پر ہم تمدن یا تہذیب کہتے ہیں۔ ادب کو کسی معاشرے کی ایسی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے جس میں مختلف زمانوں میں بدلتے تمدن کی مسلسل تصاویر نظر آتی ہیں۔ ادب قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری اپنی کتاب "ادب اور زندگی" میں اس بحث کو کچھ یوں سمیٹتے ہیں:

> "ایمرسن کہتا ہے کہ ہر دور کو خود اپنا قومی ادب پیدا کرنا چاہیے۔ یعنی ہر ادبی کارنامے میں ان عصری میلانات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے جن کے لیے جرمن زبان میں لفظ Zeitgeist کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور جس کے معنی روح عصر کے ہیں۔ آج محض حسن کاری کو ادب نہیں کہتے۔ ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین فکریات (Ideology) یعنی اجتماعی خیالات و افکار کا حامل نہیں ہے تو صحیح معنوں میں ادب نہیں ہے۔ اب یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ حسن، خیر اور حقیقت تینوں کو آہنگ دار کر کے پیش کرنے کا نام ادب ہے۔"[1]

ادب عالیہ (Classic Literature):

ادب عالیہ کی جو فوری تعریف ذہن میں آتی ہے وہ ہے "اعلیٰ ادبی تربیت یافتہ طبقے سے ہم رشتہ ادب"۔ ادب عالیہ کی خصوصیات اعلیٰ تربیت یافتہ طبقے کی فکری رفعت کے پیش نظر تخلیق پاتی ہیں۔ یعنی زبان و اسلوب کا اعلیٰ معیار، اعلیٰ ادبی اقدار اور روایات کا لحاظ اور حسنِ افکار کا منظم اظہار۔ پہلے یونان و روم سے متعلق ہر تصور کو کلاسک خیال کیا جاتا تھا پھر ان تصورات کی تقلید میں تخلیق کیے گئے ادب کو یہ مقام دیا گیا لیکن ان کے انحراف کے باوجود جو ادب میں نظم و ضبط، پختگی اور ٹھہراؤ سے بھی ادب عالیہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ ادب عالیہ کے ضمن میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ادب عالیہ پر عصری تغیرات کا اثر نہیں ہوتا اور اسے ہر عہد میں یکساں مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ فردوسی، حافظ، سعدی، امراؤالقیس، رومی، کالی داس، ورجل، دانتے، شیکسپیئر اور ملٹن وغیرہ دنیا کے کلاسک فن کار ہیں اور ان کی تخلیقات

ادب عالیہ کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح ولی، میر، سودا، آتش، مصحفی، مومن، غالب، اقبال وغیرہ کو اردو شاعری میں اور وجہی، میر امن، سرشار، سر سید، سید سلیمان ندوی، مولانا محمد حسین آزاد، آغا حشر، قرۃ العین حیدر وغیرہ کو اردو نثر کے کلاسک فن کار کہا جاتا ہے۔

مقبول عام ادب (Popular Literature):

مقبول عام ادب ایسے ادب کو کہا جاتا ہے جو ہر دل عزیز ہو۔ نیز اس میں عمومیت، عوامیت اور انسانی سماج سے قربت ہو۔ عام معاشرتی اور سماج کے مسائل آسان انداز میں بیان کیے جائیں۔ اس کے مرکزی کردار اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہ ادب عوام کے دل کی آواز ہوتی ہے اور اس کا بنیادی وصف یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے اپنی کہانی اور اپنا انداز مانے۔ مقبول عام ادب یا پاپولر لٹریچر کی تعریف پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اپنی کتاب کشاف تنقیدی اصطلاحات میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "مقبول عام ادب یا ناول سے مراد سادہ زبان میں ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمولی واقعات اور روزانہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ یہ دلچسپی پلاٹ، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ادب یا ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری خاص طور پر اہم ہیں۔" [۴]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ادب کی اصطلاح میں مقبول عام ادب اس وقت سے انسان کا ساتھی ہے جب سے اس نے بولنا، سوچنا اور لکھنا سیکھا۔ ابتدا سے لوک ادب کہا گیا جو سینہ بہ سینہ قصے کہانیوں کی صورت نسل در نسل اور قوم در قوم منتقل ہوتا رہا۔ موجودہ زمانے میں جب ذرائع ابلاغ اتنے مؤثر ثابت ہوئے کہ بہت سی تخلیقات صرف ذرائع ابلاغ ہی کی بدولت شہرت پا گئیں تو انھیں مقبول عام ادب کہا جانے لگا۔ "ایسپ کی کہانیاں" ہوں یا عطار کی "منطق الطیر"، "ہانس اینڈرسن کی "فیری ٹیلز" ہوں یا عربوں کی "الف لیلہ"، ہر قصہ موضوعات، تخیلات، کردار نگاری اور سب سے بڑھ کر عمومی / عوامی دلچسپی سے بھرپور ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقبول عام ادب ایسے موضوعات کا احاطہ کرنے لگا جو جدید دور سے ہم آہنگ ہوں۔ طلسم ہوشربا ہو یا باغ و بہار، تخیلات کا ایسا کرشمہ سامنے آتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آج بھی اس پائے کا ادب بہت شوق اور توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ پہلے جنھیں طلسمات کہا جاتا تھا آج کل اسے سائنس فکشن کا روپ دے دیا گیا۔ غرض انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ مقبول عام

ادب بھی موضوعات اور کرداروں کے حوالے سے ترقی پاتا چلا گیا۔

پاپولر ادب کی روایت صدیوں سے چلی آرہی ہے، جیسے جیسے معاشرے میں طبقات بنتے چلے گئے ویسے ہی ادب پر ان کا اثر پڑا اور اسے بھی مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں آنے والی چند تحریکوں نے اس درجہ بندی کو بہت ہوا دی تاہم ان تمام عوامل کے باوجود مقبول عام ادب ہمیشہ سے عوامی مقبولیت حاصل کرتا رہا ہے۔ حیرت انگیز طور پر ۱۹۵۰ء کے بعد بہت سے ادبی جریدے جو ادب عالیہ کے نمائندہ تھے ان کی جگہ تیزی سے ماہانہ ڈائجسٹوں نے لے لی۔ ۷۰ء کی دہائی سے کچھ رسائل تو مسلسل شائع ہو رہے ہیں اور ان کی اشاعت لاکھوں میں ہے۔ عصری منظر نامہ، خواہ ملکی ہو یا بین الاقوامی، مقبول عام ادب ہی مقبولیت اور فروخت کے ریکارڈ قائم کر رہا ہے۔ ہیری پوٹر Harry Potter ہو یا ہنگر گیمز Hunger Games، Twilight Series دیکھیں یا مشہور زمانہ جیمز بانڈ James Bond ہر طرف مقبول عام ادب ہی کا چرچا ہے۔

اردو میں جاسوسی ادب کی تاریخ

اردو میں جاسوسی ادب کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابن صفی سے پہلے کا جاسوسی ادب اور ابن صفی اور ان کے بعد کا جاسوسی ادب۔ اردو میں جاسوسی ادب کی ابتدا تراجم سے ہوتی ہے۔ گو ادب عالیہ کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا گیا اور اردو ادب کے بڑے معتبر نام ترجمہ کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہیں تاہم عوام کی دلچسپی کے باعث زیادہ تر جاسوسی قصے کہانیاں ترجمہ کی گئیں۔ اردو میں جاسوسی ادب کے آغاز کے متعلق مرزا حامد بیگ اپنی کتاب ''اردو میں ترجمے کی روایت'' کے ابتدائیے میں بیان کرتے ہیں:

> ''مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی Marie Corelli کے پانچ جاسوسی ناولوں کو ''خونی بھید''، ''خونی جورو''، ''خونی مصور''، ''خونی عاشق'' اور ''بہرام کی رہائی'' کے نام سے ۱۹۲۸ء تک ترجمہ کر کے طبع کروا دیا تھا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ انھوں نے اپنی طبع زاد فکشن میں جاسوسی عنصر کو شامل ہونے نہیں دیا۔ البتہ

جاسوسی ادب سے اثر پذیری ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ مرحلہ رسائی کے ادب میں داخل ہو گئی۔ اور تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد ناول اس سے اگلا قدم ہیں۔ جب کہ بطور مترجم تیرتھ رام فیروز پوری نے ایک سو دس ناولوں کے تراجم مطبوعہ کتابی صورت میں یادگار چھوڑے ہے۔"[۳]

اسی کتاب میں آگے چل کر وہ اس ضمن میں مزید تفصیل بیان کرتے ہیں:

"اردو میں جاسوسی ناول کے ترجمے کی روایت تاریخی تسلسل کے مطابق آگے نہیں بڑھی اور نہ ہی ترجمہ کا انتخاب کرتے وقت ہمارے ہاں کے مترجمین نے اچھے اور خراب ناول کی تمیز کو روا رکھا۔ اردو میں جاسوسی ناول متعارف کروانے کا سہرا ظفر عمر کے سر ہے جنھوں نے فرانس کے مارس لیبلانک Maurice Leblanc کے عالمی شہرت یافتہ جاسوسی ناول کا "نیلی چھتری" کے نام سے ۱۹۱۹ء میں ترجمہ کیا اور اس کے بعد مرزا ہادی رسوا، تیرتھ رام فیروز پوری، ندیم صہبائی اور پنڈت کشن راج شرما آنند اس راہ پر چل نکلے۔"[۴]

مرزا حامد بیگ اپنی کتاب میں جاسوسی ادب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ظفر عمر خود محکمہ پولیس سے متعلق تھے، ۱۹۳۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے مارس لیبلانک کے فرانسیسی زبان کے ناول کو "نیلی چھتری" کے عنوان سے ترجمہ کرنے کے بعد خود جاسوسی ناول لکھے اور اپنے دیکھے بھالے جرائم پیشہ افراد کی نفسیات اور ان کی عیاریوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا۔ البتہ مرزا ہادی رسوا نے خود کوئی جاسوسی ناول لکھنے کا تجربہ نہیں کیا۔ ہاں تیرتھ رام فیروز پوری نے جاسوسی ناولوں کے تراجم میں بڑا نام پیدا کیا، خود بھی طبع زاد جاسوسی ناول لکھے۔"[۵]

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ پروفیسر مجنوں گورکھپوری اپنے مضمون میں بڑے واضح انداز میں لکھتے ہیں کہ ابن صفی سے قبل کوئی بھی طبع زاد جاسوسی ناول نہیں لکھا گیا مگر مرزا حامد بیگ اس ضمن میں چند مصنفین اور ان کی تخلیقات کی فہرست بھی دیتے ہیں جو مرزا حامد بیگ کی تحقیق کے مطابق طبع زاد جاسوسی ناولوں کے تخلیق کار تھے۔[۶]

مصنف	تخلیقات	سن طباعت	ناشر
پنڈت کشور چند	رتن بے بہا (پانچ جلدیں)، جام جہاں نما، بدر الاسلام بیگم، لیڈی کی کرامت، بدیع ماہ وتی	-	لالہ دیوی داس جانکی داس امرتسر
طالب بنارسی لکھنوی	ایران کا چاند	اپریل ۱۹۳۹ء	سیٹھ آدم جی عبداللہ اینڈ کمپنی بمبئی
ندا علی خنجر	خونی بھائی	۱۹۳۳ء	ہمدم برقی پریس لکھنو
سید شہنشاہ حسین	خونی بہن	۱۹۳۳ء	-
پی ایس نسیم	خونی تولہ	-	خود محمد شفیع لاہور
-	خونی ملاح	-	انڈین پریس لکھنو
نور محمد عشرت	خونی بہرام	-	فضل بک ڈپو لاہور
احمد اللہ خاں	خونی ہنگری	-	شمس المطابع آگرہ
طالب الہ آبادی	خونی کی پہچان	۱۹۳۹ء	
-	خون کی پیاس	۱۹۳۶ء	دار الاشاعت پنجاب

مرزا حامد بیگ جاسوسی رسائل اور تراجم کی مختصر تاریخ بھی بیان کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں:

"جاسوسی ناولوں کے علاوہ جاسوسی ادب سے متعلق رسائل بھی چھپنے لگے۔ مثال کے طور پر قیام پاکستان کے بعد جنوری ۱۹۵۲ء میں ادارہ "نکہت" الہ آباد (بھارت) سے "جاسوسی دنیا" نکلنا شروع ہوا۔ بعد ازاں کراچی پاکستان سے ماہنامہ "سی آئی اے" اور "آتش" جاری ہوئے۔ البتہ دلچسپ بات یہ ہے کہ 'جاسوسی ادب' سے دلچسپی کا عالم ۱۹۰۲ء میں علمی اور سائنسی تراجم کے ساتھ ہی ہو گیا تھا جب پانی پت سے ۱۹۰۲ء میں تراجم پر مبنی "جاسوسی قصے" نام کی ایک انتھالوجی شائع ہوئی۔" [۲۷]

"اردو ترجمے کی روایت" نامی یہ کتاب ابن صفی میگزین، الف لیلیٰ ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،

جاسوسی ڈائجسٹ اور نئے افق وغیرہ کے تذکرے سے عاری ہے جس میں ابن صفی کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ غیر ملکی ناول بھی تلخیص و ترجمہ کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں خان محبوب طرزی، اکرم الہ آبادی اور اظہار اثر کا تذکرہ نہیں ملتا جو جاسوسی ادب کے اہم نام ہیں۔ اسی طرح تراجم میں ایک اہم نام مسز عبدالقادر (پیدائش ۱۸۹۸ء۔ وفات نامعلوم) کا بھی ہے جنھوں نے انگریزی زبان کے بہت سے ناول جنھیں Gothic Novels کہا جاتا ہے اردو میں ترجمہ کیے۔ ان کی تصانیف میں سے کہانیوں کا پہلا مجموعہ "لاشوں کا شہر" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اور ایک سماجی ناول "تنہائی" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔[۸] مسز عبدالقادر کے بارے میں پروفیسر سلیم اختر اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں بیان کرتے ہیں:

> "مسز عبدالقادر نے اپنے خوف ناک اور پر اسرار ناول، نوجوان خواتین ناول نگاروں سے کہیں پہلے لکھے تھے لیکن وہ قارئین (مرد اور عورت کی تخصیص نہیں) کے ایک حلقہ میں آج بھی مقبول ہیں۔ وہ اردو میں اس نوع کے ادب کی واحد اور کامیاب مصنفہ ہیں اتنی کہ برام سٹوکر Bram Stoker اور ڈینس ویٹلے Dennis Wheatley جیسے مغربی مصنفین کے ساتھ ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔"[۹]

حال ہی میں کی گئی ایک اور تحقیق کے مطابق نہ صرف انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبانوں کے ناول اردو زبان میں ترجمہ کیے گئے بلکہ فارسی زبان سے بھی جاسوسی ناول اردو میں ڈھالے گئے۔ اس موضوع پر فاروق احمد کی تحقیق کچھ یوں ہے:

> "ابتدائی تلاش و بسیار کے بعد لاہور سے کچھ تراجم ملے ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اردو زبان کا اب تک کا دستیاب ناول "پراسرار قتل" ہے جو کشمیری پریس انارکلی بازار لاہور سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول بھی ایک انگریزی ناول کا ترجمہ شدہ ہے۔ اس کے مترجم ٹھاکر چھبراج چند شاد پوری تھے۔ چند مزید ناولوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف انگریزی زبان، بلکہ فارسی زبان سے بھی جاسوسی قصے کہانیاں اردو کے قالب میں ڈھلتی جاتی رہی ہیں۔ ان میں باقی عباسی (منشی فاضل) کا ترجمہ شدہ فارسی جاسوسی ناول "خونی پروفیسر" کے نام سے

جنٹلمین بک ڈپو امین آباد لکھنو کا مطبوعہ ۱۹۲۳ء اور "عمیرہ و ریحانہ" نامی ناول جسے منشی محمد عبدالحفیظ نے فارسی سے ترجمہ کیا ۱۹۲۰ء میں نامی پریس لکھنو سے شائع ہوا۔"[۱۰]

"اردو میں جاسوسی افسانہ" کے نام سے پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے بھی جاسوسی ادب کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔اس مضمون میں مجنوں گورکھپوری جاسوسی ادب کے مترجمین اور ان کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون تاریخ سے زیادہ مصنفین کے فن کا جائزہ لگتا ہے تاہم اس میں کئی اہم عوامل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جاسوسی ناولوں کے آغاز کے بارے میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری اپنے مضمون "اردو میں جاسوسی افسانہ" میں لکھتے ہیں:

"لیکن جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کرتا ہے اردو میں باقاعدہ جاسوسی قصوں اور ناولوں کی ابتدا فیروز دین مراد سے ہوتی ہے، جو کسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا کے لیکچرر تھے۔ آج لوگ ان کے نام اور ان کی تحریروں کو بھول چکے ہیں۔ فیروز دین مراد نے شرلک ہومز Sherlock Holmes کو اردو میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن شاید ان کو زیادہ موقع نہ ملا کہ وہ مسلسل شرلک ہومز کے تمام کارناموں کا اردو میں ترجمہ کر ڈالیں۔ انھوں نے شرلک ہومز کے منتخب جاسوسی افسانوں کا "حکایات شرلک ہومز" کے نام سے ترجمہ کیا اور شرلک کے ناول "اے سٹڈی ان سکارلٹ A Study in Scarlet" کا جو شرلک ہومز کا پہلا ناول ہے "خون کا چشق" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمے ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور گھر گھر پڑھے گئے۔"[۱۱]

ظفر عمر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"فیروز دین مراد کے ساتھ لازمی طور پر ظفر عمر کی یاد آتی ہے۔ تقدم و تاخر کے اعتبار سے میں ان دونوں کے ساتھ کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ فیروز دین اور ظفر عمر ہم عصر تھے اور دونوں علی گڑھ میں ساتھ رہے لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو کو انھی دونوں نے جاسوسی افسانہ نگاری سے آشنا کیا اور اس کو افسانہ نگاری کی ایک الگ صنف بنا کر پیش کیا۔ فیروز دین مراد نے سیدھے سیدھے شرلک ہومز کے

ترجمے کیے لیکن ظفر عمر نے ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے ماریس لبلانک Maurice Leblanc کے کردار آرسین لوپن Arsène Lupin کو بہرام کا روپ دینا ضروری سمجھا۔ یعنی انھوں نے فرانسیسی ناول نگار کے افسانوں کو اس طرح پیش کیا کہ ان کے پڑھنے والے ان افسانوں کو طبع زاد سمجھنے لگے۔ لیکن ایک خصوصیت ظفر عمر کے افسانوں میں ایسی ہے جو بہت اطمینان بخش ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی سطح اور ہلکی ادبی کیفیت کو قائم رکھا۔"[۱۲]

اس تحریر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظفر عمر صرف تراجم کرتے رہے اور ان کے مشہور طبع زاد ناول بھی فرانسیسی کرداروں کا اردو چربہ تھے۔ تیرتھ رام فیروزپوری کے تراجم اور طبع زاد تخلیقات پر پروفیسر صاحب یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"بعض لکھنے والے ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی ادبی خصوصیت ہو یا نہ ہو صرف ان کی تصانیف کی تعداد کی بنا پر ان کو قابل ذکر سمجھنا پڑتا ہے۔ تیرتھ رام فیروزپوری بھی اردو کے ایسے ہی افسانہ نگاروں میں ہیں۔ شاید تخلیق یا اخذ کی صلاحیت ان میں نہیں تھی۔ اپنی اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنا دائرۂ عمل ترجموں تک محدود رکھا اور پھر انھوں نے اتنے ترجمے کیے کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے (مرزا حامد بیگ نے تیرتھ رام فیروزپوری کے تراجم کی تعداد اپنی متذکرہ بالا کتاب میں ۱۰۰ درج کی ہے جب کہ یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے)۔ یہ سارے ترجمے عموماً انگریزی زبان سے کیے گئے ہیں۔ رینالڈز، رائیڈر ہیگرڈ اور اسی حیثیت کے دوسری اور تیسری صف کے انگریزی افسانہ نگاروں کے ترجمے وہ کرتے رہے جن میں کچھ ایسے افسانے ہیں جو مخزن اسرار ہیں۔ مثلاً رائیڈر ہیگرڈ کے ترجمے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض جاسوسی ناولوں کے بھی ترجمے کیے لیکن ان جاسوسی افسانوں سے بھی کوئی مستقل معیار قائم نہیں ہوتا۔ دوسری بات جو ایک باذوق پڑھنے والے کو تیرتھ رام فیروزپوری کے افسانوں میں کھٹکتی ہے وہ زبان کا نقص ہے۔ ترجمے کی دھن میں وہ زبان کے معیار اور اس کے محاورات کا لحاظ نہیں رکھتے۔"[۱۳]

یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ تیرتھ رام فیروزپوری کی استعداد بھی صرف تراجم تک محدود رہی اور وہ بھی کوئی جاسوسی افسانہ نہ تخلیق کر سکے۔ مندرجہ بالا تین مترجمین پر بات کرنے کے بعد وہ اپنے مضمون میں مسعود جاوید، ابن صفی اور اکرم الہ آبادی پر بات کرتے ہیں۔ مسعود جاوید کی شہرت بھی مترجم کے طور پر ہے۔ ان کی سب سے مشہور تخلیق "طاغوت" نامی ناول ہے۔ مسعود جاوید کی تخلیقی صلاحیت اور انداز تحریر پر مجنوں گورکھپوری کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "مسعود جاوید ایک خاص سطح کے جاسوسی افسانے لکھتے تھے جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھنے والا ایک خاص تربیت یافتہ ذہنی اور فکری صلاحیت کا آدمی ہے۔ ان کی زبان عوام کی سطح سے قریب ہوتے ہوئے بھی عیوب سے پاک ہوتی تھی۔ اور پھر انھوں نے بعض ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کا تعلق باطنیت یا ماورائیت سے ہے اگرچہ وہ جاسوسی بھی ہوتے ہیں۔" [۱۴]

یہاں مجنوں گورکھپوری کے بیان سے یہ واضح نہیں ہو رہا کہ مسعود جاوید طبع زاد لکھتے تھے یا تراجم۔ تاہم وہ ساری زندگی لکھنؤ سے باہر نہ نکل سکے اور قرین قیاس یہی ہے کہ وہ بھی غیر ملکی زبانوں کے ناول مشرف بہ اردو کرتے رہے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب "اردو میں ترجمے کی روایت" میں ان کے ترجمہ شدہ ناول "طاغوت" کا تذکرہ کیا ہے جو کتابی دنیا نظیر آباد لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ایک انگریزی ناول The Devil Rides Out کا ترجمہ ہے جو Dennis Wheatley نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک ایڈیشن پاکستان سے بھی شائع ہوا۔ [۱۵، ۵۹۶] اسی مضمون میں آگے چل کر مجنوں گورکھپوری جناب اکرم الہ آبادی اور ابن صفی کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> "اس عنوان کے دوسرے لکھنے والوں میں ابن صفی اور اکرم الہ آبادی کا نام ساتھ ساتھ ذہن میں آتا ہے۔ معلوم نہیں ایسا ہے یا نہیں لیکن میرا ایک مجموعی تاثر یہ ہے کہ ابن صفی اور اکرم الہ آبادی دونوں کے افسانے قصد و اہتمام کے ساتھ ایک دوسرے کے متوازی اور باہم مشابہ ہوتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کس نے کس کی تقلید کی۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ اکرم الہ آبادی نے ابن صفی کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے۔ غور کے ساتھ ہر مطالعہ کرنے والے کو یہ محسوس ہوگا کہ فریدی، حمید اور قاسم (ابن صفی کے تخلیق کردہ کردار)

اختراعی کردار ہیں اور خان، بالے اور شوکت (اکرم الہ آبادی کے کردار) ان کے چربے ہیں۔ کہیں کہیں یہ نقل بھونڈی اور بھدی ہو جاتی ہے۔"[۱۵]

اکرم الہ آبادی (پیدائش ۱۹۲۳ء۔ وفات ۱۹۹۰ء) کا پہلا ناول ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آیا اور ان کے مشہور کرداروں میں سپرنٹنڈنٹ منصور احمد جو خان کے نام سے مشہور ہیں اور سارجنٹ اقبال احمد جو بالے کے نام سے مشہور ہیں، شامل ہیں۔ ان کرداروں کے علاوہ انھوں نے انسپکٹر مدھوکر، سارجنٹ راشی، انسپکٹر صادق، سارجنٹ جیکب، انسپکٹر فیض اور سارجنٹ جامی جیسے کردار بھی تخلیق کیے۔ ان کی تخلیقات کی تعداد سو سے زائد ہے۔[۱۶] جاسوسی دنیا کی طرز پر انھوں نے ایک رسالہ "طوفانی پنجہ" کے نام سے جاری کیا، جس میں ہر ماہ ایک جاسوسی ناول شائع ہوتا تھا۔ اکرم الہ آبادی کے علاوہ اظہار اثر (پیدائش ۱۹۲۸ء۔ وفات ۲۰۱۱ء) بھی جاسوسی ادب کا ایک اہم نام ہے۔ تقسیم ہندوستان کے وقت وہ لاہور سے دہلی منتقل ہو گئے۔[۱۷] انھوں نے سائنس فکشن میں خاطر خواہ اضافہ کیا جو زیادہ تر تراجم پر مشتمل تھا۔ انھوں نے بھی ایک ماہنامہ جاری کیا۔ ابن صفی اور اظہار اثر میں ایک اور قدر بھی مشترک ہے کہ دونوں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ ابن صفی کا مجموعہ کلام "متاع قلب و نظر" ۲۰۱۳ء میں ان کی وفات کے ۳۳ برس بعد منظر عام پر آیا جب کہ اظہار اثر کا مجموعہ کلام "ریگ رواں" ۱۹۷۶ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اظہار اثر نے "آج کی سائنس" کے نام سے جدید سائنسی نظریات کو سلیس اردو میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب اردو اکادمی دہلی نے ۲۰۰۹ء میں شائع کی۔[۱۸]

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جناب ابن صفی سے قبل جاسوسی ناول و افسانہ صرف تراجم تک محدود تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جاسوسی دنیا کے پہلے شمارے میں موجود ناول "دلیر مجرم" کے ساتھ ہی اردو میں طبع زاد جاسوسی ادب کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ ان کی وفات ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ اب تک اردو ادب کے اس اہم گوشے کو نظر انداز کیا گیا اور ایسی کوئی تحقیق نظر نہیں آتی جس سے اردو زبان میں جاسوسی ادب کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں روشنی ڈالی جا سکے۔

ابن صفی کی ادبی زندگی کا پس منظر

ابن صفی کی ادبی زندگی کا غیر رسمی آغاز جماعت ہفتم میں ہی ہو گیا تھا جب انھوں نے اپنی پہلی کہانی لکھی۔ میٹرک تک ان کی کہانیاں ہفت روزہ "شاہد" میں گاہے بگاہے چھپتی رہیں۔ کالج کے دنوں میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا ملی اور انھوں نے اس دور میں باقاعدہ مشاعرے بھی پڑھے تاہم ان کی ادبی

زندگی کا باقاعدہ آغاز ماہنامہ ''نکہت'' الٰہ آباد سے ہوا۔ اُن کی ادبی زندگی کا جائزہ لینے سے پیشتر ضروری ہے کہ تمام داخلی اور خارجی عوامل پر نظر ڈالی جائے جس کے زیرِ اثر انھوں نے شاعری، مزاح نگاری اور پھر جاسوسی ادب تخلیق کیا۔ ان عوامل میں ابنِ صفی کے خانوادے اور اس دور کی مجموعی سیاسی و ادبی فضا متعلق رکھتے ہیں کہ یہی اس تخلیقی ذہن کا باعث بنتے ہیں جس کے باعث ایک ادیب یا شاعر کچھ تخلیق کرتا ہے۔

اولاً، ابنِ صفی جن خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے وہ صاحبِ علم اور علم دوست گھرانے تھے۔ ننھیالی خاندان تو حکیموں کے خاندان کے نام سے مشہور رہا تھا۔ اُن کے والد کو بھی مطالعے کا شوق تھا جس کی وجہ سے گھر میں بہت سی کتب موجود تھیں۔ والد کے ساتھ ساتھ والدہ بھی اس دور میں شائع ہونے والے خواتین کے معیاری رسالے پڑھا کرتی تھیں۔ دادا ایک انتہائی قابل حکیم اور نانا ایک مشہور وکیل۔ اس علمی و ادبی ماحول کا براہِ راست اثر ابنِ صفی پر پڑا اور انھوں نے صغر سنی سے ہی مطالعے کی عادت اپنا لی۔ جس عمر میں دوسرے بچے کھیلوں میں مشغول ہوتے ابنِ صفی مطالعے میں مصروف ہوتے۔ اس مطالعے نے خاص طور پر طلسم ہوشربا اور رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں نے ان کے ذہن اور خصوصاً دل میں بے حد جگہ بنائی۔ ان کی تحریروں پر اس ابتدائی مطالعے کا بڑا گہرا اثر پڑا۔

دوم، ابنِ صفی نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ برصغیر میں سیاسی بیداری کی دہائیاں تھیں۔ دو قومی نظریہ وجود میں آ چکا تھا اور مسلمانانِ ہند کا سیاسی شعور خاصہ پختہ ہو چکا تھا۔ علی گڑھ کے نوجوان اس تحریک میں شامل ہو چکے تھے اور بڑی حد تک ہندو ذہنیت مسلمانوں پر واضح ہو چکی تھی۔ ابنِ صفی کے بچپن اور لڑکپن میں ہونے والے دو اہم واقعات کانگریس کی حکومت اور یومِ نجات اور دوسرا قراردادِ پاکستان کا منظور ہونا شامل تھے۔ اس دور کا سیاسی بیانیہ اس لیے اہم ہے کہ اس عہد میں جنم لینے والا تمام ادب بالواسطہ اور بلاواسطہ ان تمام سیاسی تحریکات اور واقعات سے گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ حکومت مخالف کالم، تقریریں اور جلسے روزمرہ کا معمول تھا۔ فکاہیہ اور طنزیہ کالموں اور تقریروں پر بڑے بڑے سیاسی رہنما جیل جا چکے تھے۔ حسرت موہانی اور ظفر علی خان صحافت و خطابت کے میدان میں پیش پیش تھے۔ لہٰذا ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات نمودار ہوئے۔

سوم، الٰہ آباد کی مجموعی فضا پرسکون تھی اور ادبی محفلوں اور مشاعروں کے لیے بڑی سازگار تھی۔ یہ وہ دور ہے جب الٰہ آباد میں عباس حسینی، شکیل جمالی، راہی معصوم رضا، مجاور حسین رضوی (ابنِ سعید)، تیغ الٰہ آبادی (مصطفیٰ زیدی)، نازش پرتاپ گڑھی، قمر جاسی، سرور حسین (سرور جہاں آبادی) اور ان

جیسے ان گنت طلبا ذہنی اور ادبی استعداد بڑھانے میں مصروف تھے۔ یہ سب ابن صفی کے قریبی رفقا میں سے تھے۔ ایسے ادبی دوستوں کی سنگت میں اس نوجوان طبقے کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آئیں اور شاعری اور نثر کے میدان میں خوب جھنڈے گاڑے گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کالج اور بعد ازاں جامعہ میں موجود اساتذہ بھی ایسے ادب پرور اور ذہن ساز تھے جنھوں نے اپنے طلبا کی کردار اور فکر سازی میں مثبت کردار ادا کیا۔

چہارم، دوسری جنگ عظیم کے مہیب سائے پوری دنیا پر لہراتے رہے۔ امن کے ٹھیکے دار ایک دوسرے پر مہلک ہتھیار آزماتے رہے۔ برصغیر میں وہ تمام لوگ جو روس کو امن و آشتی کا علم بردار سمجھتے تھے اور سٹالن کے فلسفے کو آب حیات جانتے تھے وہ بھی اس وقت لاجواب ہو گئے جب روس بھی اس جنگ میں کود پڑا۔ یہ طوفان ریزی چھ سال جاری رہی اور اس وقت رکی جب امریکہ نے تاریخ انسانی کا سب سے مہلک ہتھیار استعمال کر کے لاکھوں جانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی۔ ہندوستان بھی اس جنگ سے بہت متاثر ہوا یہاں کے بہت سے جوان برطانوی فوجوں میں شامل ہو کر اس جنگ کا ایندھن بنے۔ یہ واقعہ بھی حساس ذہنوں پر ایک تازیانہ بن کر گرا اور ابن صفی کے ذہن پر بھی بڑے ان مٹ اثرات ڈالے۔

پنجم، برصغیر پاک و ہند کے لیے ۱۹۴۷ء صرف ایک سال کا نام نہیں، بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے گوناگوں تجربات کی علامت بھی ہے۔ اس واقعے نے خارجی و داخلی دنیاؤں پر بھی اپنے گہرے نقوش ثبت کیے۔ اس تقسیم کے بہت سی زندگیوں پر متنوع اثرات مرتب ہوئے۔ اس واقعے کے بعد کی زندگی جغرافیائی، سیاسی، تہذیبی، نفسیاتی، لسانی اور علاقائی اعتبار سے متاثر ہوئی۔ انفرادی اور اجتماعی رشتوں کے نئے پہلو ظاہر ہوئے۔ فسادات اور ہجرت نے وقتی اور دیرپا جسمانی، ذہنی، سیاسی اور معاشرتی اثرات قائم کیے۔ بہت سے لوگ جو ہندوستان نہیں چھوڑنا چاہتے تھے مجبوراً انھیں ہجرت کرنا پڑی۔ ملا واحدی جیسا دلی کا دیوانہ بھی آخر اپنی محبوبہ دلی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا وہ خود اس کی وجہ بتاتے ہیں:

> "اگرچہ گاندھی جی بھی شہر میں موجود تھے اور چند ذی حیثیت مسلمانوں کی کاوشوں سے دلی کے مسلم خاندانوں کی حفاظت پر سپاہی بھی تعینات ہوئے تاہم جب بلوائی آتے ہندو سپاہی اور فوجی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ہی گولیاں برساتے۔"[۱۹]

اس واقعے نے ادبا اور شعرا کی زندگیوں اور فن کو بھی متاثر کیا۔ قرۃ العین حیدر تقسیم ہند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ میرے لیے دوسرا زبردست ذہنی وجذباتی حادثہ تھا۔ میں نے افسانے ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیے تھے۔ تقسیم ہند کے صدمے نے ۱۹۴۷ء کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے "میرے بھی صنم خانے" لکھوایا جو میرا پہلا ناول تھا اور جسے آج بھی اردو کے اچھے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اس صدمے کے زیر اثر لکھا۔" [۳۰]

ہند و پاک میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے تخلیقات نظم ونثر پیش کیں۔ ان میں قرۃ العین کا ناول "آگ کا دریا"، کرشن چندر کی تخلیق "پشاور ایکسپریس"، منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو"، پنجابی میں امرتا پریتم کی نظم "اج آکھاں وارث شاہ نوں"، خوشونت سنگھ کا انگریزی ناول "A Train to Pakistan" اور سندھی زبان میں شیخ ایاز کی کہانی "پڑوسی" اسی نوع کی تخلیقات ہیں جنھوں نے ادب میں ایک نیا منظر نامہ تشکیل دیا۔

ابن صفی کے ادبی پس منظر میں ہمیں بہت سے داخلی وخارجی عوامل نظر آتے ہیں۔ داخلی عوامل میں خاندان کے بزرگ، شعری و ادبی ماحول اور مطالعے کا شوق لاشعوری طور پر وہ محرک بنے جس نے ابن صفی کی نفسی ونفسیاتی تحلیل اور ایک شاعر اور ادیب کی ذہنی تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ خارجی عناصر میں اساتذہ اور دوستوں کے علاوہ دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند شامل تھے۔ اس پس منظر میں ابن صفی کے ادبی سفر کا آغاز ہوا جس نے برصغیر میں ادب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ادبی منظر نامے میں مقبول عام ادب نے ادب عالیہ کو پیچھے چھوڑ دیا اور پاک و ہند میں ایک نئی طرز کی لائبریریوں کا قیام عمل میں آیا، جہاں سے قارئین ابن صفی کے ناول کرائے پر لے کر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔

ادبی زندگی کا آغاز

ابن صفی کی ادبی زندگی کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب انھوں نے "طلسم ہوشربا" کی جلدیں پڑھنا شروع کر دیں۔ اس طول پذیر داستان نے ان کے ذہن میں ایسی جگہ بنائی کہ وہ ساری عمر اس کے طلسم سے باہر نہ نکل سکے۔ ابن صفی خود اس داستان کے اپنے اوپر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سورج غروب ہوتے ہی سال خوردہ صحراؤں میں ابابیلیں بسیرا لینے آتیں اور
مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے اب باغِ سحر میں افراسیاب کی محفل سجے گی اور
چالاک بن عمرو، ملکہ حیرت کی کسی کنیز کے بھیس میں اسی کی سواری کے ہمراہ اس
محفل میں در آئے گا۔ میں گھنٹوں طلسم ہوشربا کے کرداروں کے بارے میں
سوچتا رہتا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں پڑھ ڈالی
تھیں اور خواجہ عمرو کے شاگردوں میں برق فرنگی میرا پسندیدہ کردار تھا اور
میری خواہش تھی کاش چالاک بن عمرو کی بجائے برق فرنگی ملکہ حیرت پر عاشق
ہوتا۔ پتا نہیں کیوں چالاک بن عمرو مجھے کچھ مولوی مولوی سا لگتا تھا۔۔۔ اور اسی
سات آٹھ سال کی عمر میں یہ بھی سوچتا تھا کاش ملکہ زمرد اس شمشیر زن شہزادہ ایرج
کی بجائے مجھ پر عاشق ہو جاتی۔" [۴۱]

پرائمری سکول کے بعد ابن صفی مزید تعلیم کے لیے الہ آباد منتقل ہو گئے۔ کتابیں نارا ہی میں رہ گئیں۔ مطالعہ کی عادت انھیں پڑ چکی تھی؛ منقطع ہو کر رہ گیا طبیعت پر یہ بات گراں گزری اور وہ خود اپنی ذہنی کیفیات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سکول سے واپس آ کر بڑی الجھن میں مبتلا رہتا۔ پھر ہوائی قلعے بنتے تھے اور
خود کو طلسم ہوشربا کی حدود میں پاتا کسی مظلوم جادوگرنی کے لیے کوئی کارنامہ
سر انجام دے کر اس کی آنکھوں کا تارا بنتا اور اس کی مدد سے پورا مطبع منشی نول کشور
کا خواب ملتا۔ دن گزرتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ شہر تو بڑی واہیات جگہ ہوتی
ہے جہاں (جیسا اس پیچھے سے ہو تو) آدمی مطالعے کو ترس جاتا ہے۔" [۴۲]

ابھی وہ دن جب وہ "طلسم ہوشربا" سے دور اپنے خیالوں میں اس کہانی کے رنگ بھر رہے تھے انھیں اپنے دوست کے گھر رائیڈر ہیگرڈ کے دو ناول She[۴۳] اور Ayesha, the return of She[۴۴] کے اردو تراجم پڑھنے کا موقع ملا۔ اب ان ناولوں نے ان کے ذہن پر کیا کیا نقش چھوڑے ابن صفی خود ہی اس بارے میں بیان کرتے ہیں۔

"ایک دن ایک ہم جماعت کے گھر دو کتابیں نظر آئیں۔ ایک کا نام "عذرا"
(She) "اور دوسری کا نام "عذرا کی واپسی (Ayesha, the Return of

"She" (نانا مرحوم علامہ یا کسی دوسرے بزرگ کا ترجمہ۔) کسی نہ کسی طرح وہ
جلد ہی اس میں بیٹھ کر پڑھ ڈالیں اور بالکل ہی نئے قسم کے خوابوں میں ڈوب
گیا۔۔۔اب مجھے صندل راماتی اور بڑے غور سے دیکھتی ہوئی نام پوچھتی۔ میں کہتا
خاکسار کو اسرار احمد ناروی کہتے ہیں۔ ٹھنڈی سانس لیتی اور بہت دردناک لہجے
میں کہتی "نہیں تم کلکراٹیس ہو۔۔۔میرے محبوب۔۔۔اب سے ہزاروں سال
پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ میں غیر فانی تھی تم مر گئے تھے۔۔۔تم
نے پتہ نہیں کہاں کہاں کتنے جنم لیے اور میں تمھاری تلاش میں سرگرداں
رہی۔۔۔اب الٰہ آباد میں ملے ہو۔۔۔کیا عمر ہے تمھاری۔۔۔؟

دس سال۔ میں جواب دیتا۔

خیر۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی، میں دس سال اور انتظار کروں گی۔

اس طرح رائیڈر ہیگرڈ نے میرے کچے ذہن پر تسلط جمایا۔ طلسم ہوشربا اور
رائیڈر ہیگرڈ کے تاثرات نے آپس میں گڈمڈ ہو کر میرے لیے ایک عجیب سی
ذہنی فضا پیدا کر دی تھی، جس میں ہر وقت ڈوبا رہتا۔

ایسے ایسے خواب دیکھتا کہ بس۔۔۔۔

خوابوں اور مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔" [۴۵]

ابن صفی نے اپنی پہلی کہانی ساتویں جماعت میں لکھی۔ یہ کہانی ہفت روزہ "شاہد" میں شائع
ہوئی۔ وہ اپنے مضمون "بقلم خود" میں اس کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"پہلی کہانی اس وقت لکھی جب ساتویں درجے کا طالب علم تھا۔ اس کا نام
"ناکام آرزو" تھا۔ یہ کہانی عادل رشید مرحوم نے اپنے ہفت روزہ رسالے
"شاہد" میں شائع کی تھی۔" [۴۶]

اپنے مضمون "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا" میں وہ اس کہانی سے جڑا ایک لطیفہ بھی بیان کرتے
ہیں:

"یہ افسانہ میں نے ہفت روزہ "شاہد" بمبئی میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ جناب
عادل رشید اس ہفت روزے کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مجھے کوئی معمر آدمی سمجھ کر کچھ

اس طرح میرا نام کہانی کے ساتھ شائع کیا تھا۔

""نتیجۂ فکر مسعود رجب پاتے حضرت اسرار الحق"

کہانی چھپتے ہی میری شامت آ گئی۔ گھر کے بڑوں نے مجھے اس طرح مخاطب کرنا شروع کیا:

"ابے او مسعود رجب پاتے ذرا ایک گلاس پانی تو لانا۔"[۴۷]

میٹرک تک ان کی کہانیاں جو زیادہ تر رومانی ہوتی تھیں "شاہد" میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہیں۔ میٹرک میں ہی انھوں نے شاعری بھی شروع کر دی۔ میٹرک تک ان کی وابستگی ترقی پسندوں کے ایک ایسے گروہ سے ہو گئی جو خود کو کمیونسٹ کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں اردو ادب میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا اور ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب کا واقعہ دنیا کا ایک بہت ہی اہم واقعہ ثابت ہوا اس واقعہ نے پوری دنیا پر اثرات مرتب کیے۔ دیگر ممالک کی طرح ہندوستان پر بھی اس واقعہ کے گہرے اثرات پڑے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد میں تیزی آئی۔ دوسری طرف ہندو مسلم اختلاف میں اضافہ ہوا۔ ان حالات اور سیاسی کشمکش کی بدولت مایوسی کی فضا چھانے لگی، جس کی بنا پر حساس نوجوان طبقہ میں اشتراکی رجحانات فروغ پانے لگے۔ شاعر اور ادیب بالشناقی کے برعکس لینن اور کارل مارکس کے اثر کو قبول کرنے لگے۔ جب کہ روسی ادب کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کی حیثیت افیون کی سی ہے، مذہب باطل تصور ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاش ہے۔ اس طرح اس ادب کی رو سے سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے اور ادب کا کام مذہب سے متنفر کر کے انسانیت میں اعتقاد پیدا کرنا ہے۔ اس طرح یہ نظریات ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سبب بنے۔ دوسری طرف ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فسطائیت نے سر اٹھایا، جس کی وجہ سے پورے یورپ کو ایک بحران سے گزرنا پڑا۔ ہٹلر نے جرمنی میں تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اقدار پر حملہ کیا۔ بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کر لیا۔ ہٹلر کے اس اقدام پر جون ۱۹۳۵ء میں پیرس میں چند شہرۂ آفاق شخصیتوں مثلاً رومان رولاں، ٹامس مان اور آندرے مالرو نے ثقافت کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کا نام تھا:

The world congress of the writers for the defence of culture.[۴۹]

سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اس طرح بعد میں سجاد ظہیر اور ملک

راج آنند نے کچھ دیگر ہندوستانی طلبا کی مدد سے جو لندن میں مقیم تھے۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کا پہلا جلسہ لندن کے نانکنگ ریستوران میں ہوا۔ جہاں اس انجمن کا منشور یا اعلان مرتب کیا گیا۔ اس اجلاس میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور ڈاکٹر دین محمد تاثیر وغیرہ شامل تھے۔ انجمن کا صدر ملک راج آنند کو منتخب کیا گیا۔ اس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین جو ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی وجود میں آئی۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے منشور کے ذریعے جن مقاصد کا بیان کیا وہ کچھ یوں ہیں:[29]

- فن اور ادب کو رجعت پرستوں کے چنگل سے نجات دلانا اور فنون لطیفہ کو عوام کے قریب لانا۔
- ادب میں بھوک، افلاس، غربت، سماجی پستی اور سیاسی غلامی سے بحث کرنا۔
- واقعیت اور حقیقت نگاری پر زور دینا۔ بے مقصد روحانیت اور بے روح تصوف پرستی سے پرہیز کرنا۔
- ایسی ادبی تنقید کو رواج دینا جو ترقی پسند اور سائنٹیفک رجحانات کو فروغ دے۔
- ماضی کی اقدار اور روایات کا از سر نو جائزہ لے کر صرف ان اقدار اور روایتوں کو اپنانا جو صحت مند ہوں اور زندگی کی تعمیر میں کام آ سکتی ہوں۔
- بیمار فرسودہ روایات جو سماج و ادب کی ترقی میں رکاوٹ ہیں ان کو ترک کرنا وغیرہ۔

ترقی پسند تحریک کے مذکورہ بالا مقاصد سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے منشور کے منظر عام پر آتے ہی اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں سب سے پہلے مشہور ادیب اور افسانہ نگار منشی پریم چند نے اسے خوش آمدید کہا۔ علامہ اقبال اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے حضرات نے اس تحریک کی حمایت کی اور اس تحریک کے منشور پر دستخط کرنے والوں میں منشی پریم چند، جوش، ڈاکٹر عابد حسین، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی کے علاوہ نوجوان طبقہ میں سے علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، اسرار الحق مجاز، حیات اللہ انصاری

اور شوکت احمد عباسی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی دیکھا دیکھی دور دراز کے شہروں کے نوجوانوں
نے بھی ان کے تتبع میں خود کو کمیونسٹ کہنا شروع کر دیا۔ الٰہ آباد جیسے شہر میں چند نوجوان اس رو میں بہے
اور جناب ابن صفی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اپنے اس دلچسپ تجربے کے متعلق وہ خود بیان
کرتے ہیں:

"میٹرک میں پہنچتے ہی بے پی کمیونسٹوں کا ساتھ ہو گیا۔ یہ ایسے 'کچھ لوگ' تھے
جنھوں نے کبھی پارٹی آفس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ کھدر پہنتے تھے، بال
بڑھاتے تھے اور گندری بازار سے آٹھ آٹھ آنے کی پرانی عینکیں خریدا کرتے تھے
اور کمیونسٹ کہلائے جانے کے شوق میں اچھی بھلی آنکھوں کا تیا پانچہ کر بیٹھتے
تھے۔ بہر حال ان کا ساتھ ہوتے ہی ظالم سماج اور سرمایہ داری میری شاعری
میں گھس آئے تھے۔ ان دنوں محلے کے بنیے کو سرمایہ دار سمجھتا تھا اور اپنی برادری
ظالم سماج معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ برادری سے باہر شادی کرنے پر سخت ترین
پابندیاں عائد تھیں۔ لہٰذا اپنے ہی خاندان کے کچھ بزرگ سماج کے ٹھیکے دار
ٹھہرے تھے اور دل ہی دل میں ان پر غرا کر ظالم سماج کے خلاف شاعری کیا
کرتا تھا اور جب محلے کا بنیا کسی قرض خواہ سے الجھ پڑتا تو سرمایہ داری کی شامت
آجاتی۔ ایسی دل دہلا دینے والی نظم لکھتا کہ بعد میں اس بنیے پر رحم بھی آنے لگتا۔
دوسری عالم گیر جنگ شباب پر تھی اور میں اس الجھن میں پڑا رہتا تھا کہ آخر عالمی
امن کا داعی روس کیوں نازی جرمنی کا ساتھ دے رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا
کہ اچانک روس اور جرمنی بھی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے اور میرے کھدر
پوش ساتھیوں نے ہٹلر کو گالیاں دینی شروع کر دیں----میں نے چپ چاپ
اپنا کھدر کا سوٹ اتار کر ایک طرف رکھا، بال ترشوائے اور آدمی کی جون میں
آگیا۔" [۳۰]

اس مرحلے سے بخیر و خوبی گزرنے کے بعد ان کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس میں ان کی
شاعرانہ صلاحیت کھل کر سامنے آئی۔ ایونگ کرسچین کالج میں ان کی شاعرانہ صلاحیتیں کھل کر اور کھل کر
سامنے آئیں۔ یہ وہ دور تھا جب انھوں نے باقاعدہ مشاعرے بھی پڑھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی

مشہور زمانہ نظم "بشریٰ کی آواز" لکھی جسے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ بعد ازاں الہ آباد یونیورسٹی میں بھی شاعری کا شغف پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا تاہم تقسیم ہند نے جہاں دیگر افراد کی زندگی پر اثر ڈالا وہیں ابن صفی کا حساس ذہن بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ خود اس بارے میں بتاتے ہیں:

> "برصغیر کی تقسیم کے وقت میں بی اے کے پہلے سال کا متعلم تھا اس دور کے ہنگامی بھونچال نے کافی عرصہ تک پراگندگی اور انتشار میں مبتلا رکھا۔ خوابوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی عفریت نے پورے معاشرے میں جادوئی پتھریاں برسائی ہوں۔۔۔ جیسے کوئی بہنا ہوائی برقرار رکھنے کی ہوس میں مسلسل آنکھیں کر کے جھلس گئی ہو، جیسے قدیم قلوپطرہ کا تابوت سنگسار کر دیا گیا ہو اور قبرستان میں اب کبھی محبت سر نہ اٹھا سکے گی۔" [۳۱]

جناب ابن صفی کے ہم جماعت شکیل جمالی کے بڑے بھائی جناب عباس حسینی نے ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ "نکہت" کا آغاز کیا۔ وہ خود اس کے مدیر جب کہ ابن صفی شعبہ نظم اور مجاور حسین رضوی جنھیں ابن سعید کے نام سے شہرت ملی حصہ نثر کے ذمہ دار تھے۔[۳۲] حصہ نظم دیکھنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس جریدے میں طغرل فرغان، عقرب بہارستانی اور سنکی سولجر کے قلمی نام سے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین شروع کیے۔ یہ مضامین بہت مقبول ہوئے اور ان میں حکومت کے مختلف غیر منصفانہ اقدامات پر کھل کر طنز کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں ابن صفی کی ہمشیرہ صفدرہ لطیف اپنی یادیں دہراتی ہیں:

> "بھائی جان طغرل فرغان کے نام سے ایک طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ اس کالم کا مستقل عنوان "پوسٹ مارٹم" تھا۔ پورے شہر میں اس کالم نگار کا چرچا تھا۔ لوگ اس شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتے تھے جو اتنی بے باکی اور جرأت سے حکومت پر طنزیہ کالم لکھتا تھا۔ طغرل فرغان سے صرف اس کی ماں اور بہن واقف تھیں۔ جب میری سہیلیاں طغرل فرغان کی شان میں قصیدے پڑھتیں تو میرا دل خوشی سے جھوم جاتا۔ وہ بحیثیت طغرل فرغان کی بہن کے مجھے نہیں جانتی تھیں۔" [۳۳]

ابن صفی نے اس ضمن میں جو پہلی طنزیہ کہانی لکھی اس کا نام "فرار" تھا۔ یہ بعد میں ان کے مجموعے

''ڈپلومیٹ مرغ'' [۳۴] میں شامل ہیں۔ ابن صفی صاحب کے قریبی دوست مجاور حسین رضوی جن کا
قلمی نام ابن سعید تھا اس ضمن میں مزید روشنی ڈالتے ہیں:

''پھر نکہت میں وہ ''طغرل فرغان'' اور ''مقرب بہارستانی'' کے نام سے طنزیہ
مضامین بھی لکھنے لگے۔ الٰہ آباد سے ایک روزنامہ ''نوائے ہند'' نکلتا تھا۔ اس
میں بھی ''طغرل فرغان'' کے نام سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ اسرار احمد جو
نارا ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے تھے اور اس لحاظ سے اپنا نام اسرار ناروی لکھا
کرتے تھے، طغرل فرغان ہو گئے۔ ''نکہت'' اور ''نوائے ہند'' کو ملا کر سو کے
لگ بھگ طنزیہ مضامین لکھے۔ ۵۱ء تک یہی کیفیت رہی۔'' [۳۵]

تاہم ابھی تک جناب ابن صفی نے جاسوسی ادب لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اندر ہی اندر ایک
بے چینی تھی جو انھیں کچھ اور کرنے پر اکسا رہی تھی۔ طلسم ہوش ربا اور رائیڈر ہیگرڈ کے قاری صرف طنزیہ
مزاحیہ کہانیوں پر اکتفا کرنے والے نہیں تھے۔ انھیں خود بھی اس چیز کا ادراک تھا کہ ان کی منزل کہیں اور
ہے۔ وہ خود اپنی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اس (ماہنامہ نکہت) کے لیے طنزیہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔
یہ مضامین طغرل فرغان کے نام سے لکھے جاتے تھے۔ میں یہ سب کچھ کرتا رہا
لیکن آٹھ سال کا وہ بچہ جس نے طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں چاٹ ڈالی تھیں
کسی طرح بھی میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ شعر کہنے بیٹھتا تو سامنے آ کھڑا
ہوتا۔ نثر لکھتے وقت تو قلم ہی پر ہاتھ ڈال دیتا۔۔۔ اور میں جھلا کر اس کے پیچھے
دوڑ پڑتا۔ اس کا تعاقب کرتا ہوا طلسم ہوش ربا کی فضاؤں سے گزرتا اور بالآخر وہ
مجھے رائیڈر ہیگرڈ کی غیر فانی دنیا کے دربار میں پہنچا کر نظروں سے اوجھل ہو
جاتا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے میری ساری نثری تخلیقات اجاڑ
ویرانوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں۔ بے چینی بڑھ جاتی۔ بے اطمینانی کی حد نہ
رہتی۔ پھر کیا کیا جائے؟ اکثر سوچتا۔ آخر حیرت پسندی کے رجحان کی تسکین
کیوں کر ہو؟'' [۳۶]

۱۹۵۱ء کے اواخر میں ہونے والی چند احباب کی ملاقات ان تحریروں کا باعث بنی جنھوں نے

برصغیر کے ادبی منظرنامے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ برصغیر میں اس وقت افسانہ نگاری عروج پر تھی اور عوام کی ایک بڑی تعداد انگریزی کہانیوں کی دلدادہ تھی۔ تاہم ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ان افسانوں میں رومانوی انداز جو بڑی حد تک ابتذال کے قریب تھا در آیا۔ جس سے ادبی محافل میں ہر وقت یہی موضوع بحث تھا کہ کیا اردو ادب میں صرف رومانوی اور جنسی کہانیاں ہی جگہ بنا سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں یہی بحث شروع ہوئی تو ابن صفی نے اس سے اختلاف کیا اور اسی اختلاف کا نتیجہ ماہنامہ "جاسوسی دنیا" کا اجرا تھا۔ اسی بحث کا حاصل پہلے فریدی اور حمید کی صورت میں سامنے آیا اور پھر علی عمران اور سیکرٹ سروس کی تخلیق ہوئی۔ اردو زبان میں پہلی مرتبہ سری ادب تخلیق کیا جانے لگا ورنہ اس سے پہلے صرف تراجم دستیاب تھے۔ پہلی بار مقبول عام ادب (Popular Literanure) جیسی اصطلاحات سننے کو ملیں۔
اس محفل کا حال ابن صفی نے خود مختلف جگہ بیان کیا ہے۔ اپنے مضمون "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا" مشمولہ عالمی ڈائجسٹ میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "جاسوسی ناولوں کا سلسلہ ۱۹۵۲ء میں شروع کیا تھا۔ اس کی تحریک ایک مباحثے سے ہوئی۔ ایک بزرگ کا خیال تھا کہ اردو میں صرف جنسی کہانیاں ہی مارکیٹ بنا سکتی ہیں (ان دنوں سچ مچ اردو میں ایسی کہانیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا)۔ میں ان بزرگ سے اتفاق نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں۔ "کچھ اور بھی کرنا چاہیے" کا مطالبہ بالآخر پورا ہو گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک جاسوسی ماہنامہ کی داغ بیل ڈال دی گئی اور میں اس کے لیے ہر ماہ ایک مکمل ناول لکھنے لگا۔" [۳۷]

اپنے دوسرے مضمون "بقلم خود" جو الف لیلہ ڈائجسٹ میں شائع ہوا وہ اس مباحثے کی مزید تفصیل بتاتے ہیں:

> "پھر ایک دن یہ ہوا کہ ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا: اردو میں صرف جنسی افسانوں کی مارکیٹ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا۔
> میں نے کہا" یہ درست ہے لیکن ابھی تک کسی نے بھی جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔
> کسی طرف سے آواز آئی: یہ ناممکن ہے، جب تک کوئی متبادل چیز مقابلے پر نہ

لائی جائے۔۔۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔

تھا ول چیز؟ میں نے سوچا اور پھر وہی آٹھ سال کا بچہ سامنے آ کھڑا ہوا جس نے طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں چاٹ ڈالی تھیں اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسی سال کے بوڑھے بھی بچوں کی طرح طلسم ہوشربا میں گم ہو جاتے ہیں۔

میں نے کہا: اچھی بات ہے میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ۱۹۵۰ء کے اواخر کی بات ہے۔ جب افسانوی ادب بشمول ناول میں فحاشیت کے علاوہ اور سب کچھ بہ کثرت پایا جاتا تھا۔ اور ناول میں ذہانت مفقود تھی۔ میں نے اسی ذہانت پر زور دیتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔" [۳۸]

اس ضمن میں مزید تفصیل ہمیں سجاد حسین رضوی کی یادداشتوں میں ملتی ہے:

"سکسٹن بلیک کی طرز پر اردو میں ایک جاسوسی ادارے کا منصوبہ تیار ہونے لگا۔ اس منصوبہ بندی میں بھیا (عباس حسینی)، جمال صاحب (شکیل جمالی) راہی اور حسن حیدر صاحب بھی شامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ راہی (ڈاکٹر راہی معصوم رضا ممتاز ہندوستانی افسانہ و ناول نگار) بہت اچھی جاسوسی کہانیاں لکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم لوگوں کے مقابلے میں وہ گارڈنر، پیٹر چینی، ایڈگر والیس اور اگاتھا کرسٹی کو بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے۔ بڑی برق رفتاری کے ساتھ پڑھتے تھے اور لکھتے بھی تھے۔ لیکن راہی کو نظر انداز کر کے میں نے ڈکنز کا ایک ناول منتخب کیا کہ اسی کو بنیاد بنا کر ایک کہانی لکھی جائے۔ یہ کام اسرار احمد کے سپرد ہوا۔ انھوں نے ایک ہفتہ میں ناول مکمل کر کے حوالے کر دیا اور اسے پڑھنے کے بعد راہی نے بھی جاسوسی ناول لکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ جنوری ۵۲ء میں ناول نگار کا نام ابن صفی منتخب ہوا کہ اسرار صاحب کے والد کا نام صفی اللہ تھا اور اسی مہینہ میں جاسوسی دنیا کے پہلے شمارہ کی حیثیت سے یہ ناول شائع ہوا۔" [۳۹]

یہ تھا نقطۂ آغاز اردو زبان میں ایک نئے انقلاب کا، جس کے بہاؤ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابن صفی ایک نام سے نکل کر ایک عہد بن گئے اور عوام کو پہلی بار ایک عمدہ اور معیاری تفریحی ادب پڑھنے کو ملا۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد تحریریں جن کی بدولت ہر قاری خود کو فریدی اور عمران سمجھتا

تھا۔ ایسے یہ کردار جیتے جاگتے محسوس ہوتے وہ خود کو اسی دنیا میں دیکھتا جو اسے ابن صفی دکھانا چاہتے تھے۔ ابن صفی نے جاسوسی دنیا اور بعد ازاں عمران سیریز لکھ کر دراصل ان اثرات کو مٹانے کی کوشش کی جو پہلے جنگ عظیم اور بعد ازاں تقسیم ہند کے دوران حساس ذہنوں پر ثبت ہوئے۔ وہ چونکہ خود اس مرحلے سے گزر چکے تھے لہٰذا انھوں نے مایوسی پھیلانے کے بجائے اپنے قلم سے ایک ایسی نسل کی تربیت شروع کی جو قانون کا احترام کرتی ہو اور معاشرے میں ایک مفید اضافہ ہو۔

نظریاتِ ابن صفی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف جاسوسی ادب کی تخلیق ان کی اس ذہنی اُپج کا نتیجہ تھی جو طلسم ہوشربا' یا رائیڈر ہیگرڈ کے ناول پڑھنے سے پیدا ہوئی؟ کیا ان ناولوں کا مقصد صرف تفریح کی تسکین تھی یا ابن صفی باقاعدہ کسی مقصد کے تحت لکھ رہے تھے؟ کیا دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند جیسے واقعات ابن صفی کے لیے صرف ڈراؤنے خواب ہی تھے یا پھر انھوں نے اس سے کچھ نتائج اخذ کیے؟ ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ ابن صفی کے سامنے یہ مقاصد تھے:

اول: معاشرے کے تمام افراد کو قانون کا احترام سکھانا اور ہر حال میں قانون کی بالادستی قائم رکھنا۔

دوم: معیاری اور آسان فہم زبان کا استعمال۔

سوم: معاشرے میں حب الوطنی، رواداری، زندہ دلی اور اعتدال پسندی کو فروغ دینا۔

ابن صفی کی تمام تر تخلیقات پہلے مقصد یعنی قانون کا احترام سکھانے میں نہایت کارآمد اور معاون ہیں۔ اس ضمن میں بھی ابن صفی نے خود ہی وہ مقصد بیان کر دیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ایک مضمون میں اس پر تفصیلی بات کی بلکہ جابجا اپنے ناولوں کے کرداروں سے بھی ایسی باتیں کہلوائیں جو ان کے ادبی مشن کو سامنے لانے کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ اپنے مضمون "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا" میں وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں:

> "بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں لیکن ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس نے میری پوری شخصیت کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے

سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ
گاہوں سے باہر آ گئے اور چہچہانا شروع کر دیا۔" یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بہت برا
ہوا" لیکن ہوا کیوں؟ تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمھارے گیت
اس ویرانگی کو کیوں نہ روک سکے۔ میں سوچتا رہا، سوچتا رہا، آخر کار اس نتیجے پر
پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ
ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ جاسوسی ناول
کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح بھی مہیا
کرتا ہوں اور انھیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل
ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے
کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔" [۳۰]

تو یہ تھا بنیادی مقصد ابن صفی کا جس کے تحت انھوں نے "جاسوسی دنیا" اور "عمران سیریز" کی
داغ بیل ڈالی۔ ابن صفی کی تخلیقات میں ناانصافی، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور جرائم کی وجوہات اور ان
کے سدباب پر جابجا بات کی گئی۔ پیرایہ اس طرح کا تھا کہ پڑھنے والا آسانی سے ان چیزوں کو سمجھ سکے۔
اگر قانون کے احترام پر تقریریں کروا دی جائیں تو بھی اتنا اثر نہیں ہوگا جتنا کسی قصے کہانی میں وہ
کرداروں کے درمیان ہونے والی بات چیت پڑھنے سے ہوگا۔ اسی نکتے کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں
نے اپنے قلم سے قارئین کی ایک بڑی تعداد کی فکری تربیت کی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ معیاری اردو
زبان اس سارے عمل میں ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جو غیر محسوس انداز میں قاری تک پہنچ رہی تھی۔ اس ضمن
میں وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں:

"مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علم بردار مجھ سے
کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ ان کی دانست میں شاید میں
جھک مار رہا ہوں۔ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی
نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریق کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ
رہا ہے۔ میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود ہو
جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میرے احباب کا اعلیٰ و ارفع ادب کتنے ہاتھوں تک

پہنچتا ہے اور اخروی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے؟ [۴۱]"۔

اسی مضمون کے اگلے حصے میں وہ بڑے واضح انداز میں ادب عالیہ اور مقبول عام ادب کا فرق اور اپنا ادبی مشن بیان کرتے ہیں:

> "افسانوی ادب خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی شطرنج سے نہیں بہل سکتا اسی طرح ہماری سوسائٹی کے ایک بہت بڑے حصے کے لیے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لیے کیوں لکھوں؟ میں اسی انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید اسی بہانے عوام تک کچھ ادبی باتیں بھی پہنچ جائیں۔" [۴۲]

اور یقیناً ان کے ادبی شہ پاروں کے ذریعے عوام کی بہت بڑی تعداد تک بڑی فکر انگیز باتیں پہنچیں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان کی تحریر کے ساتھ ساتھ ان کے ناولوں کے پیش لفظ جن کے لیے انھوں نے "پیشرس" جیسی خوب صورت اور ذو معنی ترکیب منتخب کی وہ بھی ابن صفی اور ان کے قارئین کے درمیان بہت سی باتیں اور نظریات باہم منتقل کرنے کا اہم ذریعہ تھا۔ انھی ابتدائی صفحات میں وہ اپنے قارئین کے بہت سے سوالات کا جواب دیتے اور قارئین کی دی گئی تجاویز کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اسی پیشرس میں وہ اگلے ناول کے متعلق ذکر کرتے اور اسی پیشرس سے وہ اہم اعلانات بھی کرتے تھے جن میں ناول کی قیمت میں اضافہ وغیرہ شامل تھے۔ ذیل میں چند اقتباسات دیے جا رہے ہیں جو ان کے ناولوں اور پیشرس سے لیے گئے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابن صفی نے اپنے ادبی مشن کو کس طرح اپنی تحریروں سے آگے بڑھایا اور اپنی تحریروں سے کئی نسلوں کی فکری، ذہنی اور نفسیاتی تربیت کی۔ آیئے اس کی ایک جھلک دیکھتے ہیں:

اپنے ناول "تیسری ناگن" کے پیشرس میں ابن صفی لکھتے ہیں:

> "مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں 'ادب' کی بھی کچھ خدمت کروں۔ عجیب بات ہے جب میرا کوئی ناول بہت پسند کیا جاتا ہے تو مجھ سے 'ادب' کی خدمت کرنے کی فرمائش ضرور کی جاتی ہے۔ بھائی! آپ تو مجھے صرف اردو کی خدمت

کرنے دیجیے (اس کے باوجود کہ صرف و نحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں)۔ آپ اس وقت میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی کا خط اس مضمون کے ساتھ ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اُردو پڑھ رہا ہوں۔ اور پھر پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کہاں تک لیا جائے؟ اب بتایئے، ادب کی خدمت کروں یا میرے لیے اُردو کی خدمت مناسب ہوگی؟ ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور سوسائٹی کی بھی... میری اس خدمت کا انداز بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور وقتی مصلحتوں کے تحت کوئی دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے۔ بہر حال میں قانون کا احترام سکھاتا ہوں۔ پھر کچھ لوگ ادب میں میرے مقام کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کی نظروں میں میرا کوئی مقام تو ضرور ہے، ورنہ آپ کو اس کی فکر ہرگز نہ ہوتی۔ اساطیری کہانیوں سے لے کر مجھ حقیر کی کہانیوں تک آپ کو ایک بھی ایسی کہانی نہ ملے گی جس میں جرائم نہ ہوں اور آج بھی آپ جسے بہت اونچے قسم کے ادب کا درجہ دیتے ہیں اور جس کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی آئے دن ہوتا رہتا ہے، کیا جرائم کے تذکروں سے پاک ہوتا ہے؟ کیا اس کے ضرر رساں پہلوؤں پر ہمارے نقادوں کی نظر نہیں پڑتی؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ کہانیوں میں بھی (جو دراصل ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتی ہیں) پولیس یا جاسوس کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔ جیسے پولیس کو اس لیے برداشت کر لیں گے کہ وہ للکار کر سامنے آتی ہے لیکن جاسوس تو بے خبری میں پتا نہیں کب گردن دبوچ لے۔ لہٰذا اگر مجھے ادب میں کوئی مقام پانے کی خواہش ہے تو جاسوس کو پھانسی دینی پڑے گی لیکن میں اس پر تیار نہیں ہوں کیوں کہ مجھے ہر حال میں شر پر خیر کی فتح کا پرچم لہرانا ہے۔ میں باطل کو حق کے سامنے سربلند دکھانا نہیں چاہتا۔ میں معاشرے میں مایوسی نہیں پھیلانا چاہتا۔ ایسی مایوسی، جو غلط راہوں پر لے چلے۔[۳۳]"

"مہلک شناسائی" نامی ناول میں وہ اور بھی کھل کر لکھتے ہیں:

"سب سے پہلا جرم ہابیل قابیل والی ٹریجڈی ہے۔ اور میں آج خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ اس ٹریجڈی سے پہلے میں نے کوئی جاسوسی ناول نہیں لکھا تھا۔ لیکن کوا بیچارہ آج تک پشیمان ہے کہ اس نے حضرت آدمؑ کو مٹی کھود کر دفن کر دینے کا فن کیوں سکھایا؟ کوے کا خیال ہے کہ اس غلطی کی بنا پر آج اولادِ آدم آدمی ہی کو زندہ دفن کر دینے کے فن میں طاق ہو گئی ہے۔ مستقبل سے مایوسی غلط فہمی ہی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے کر جاتی ہے۔ مستقبل سے مایوس ہو کر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چیلنج سے نبرد آزما ہو سکے اور یہی تلاش ہیرو ازم کی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔"[۴۴]

اپنے ناول "لاش کا بلاوا" میں انھوں نے کیا کمال باتیں تحریر کی ہیں:

"میں کہتا ہوں اگر تم قانون کو قفس سمجھتے ہو تو اجتماعی کوششوں سے اسے توڑنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اگر اس کی ہمت نہیں ہے تو تمھیں اسی قانون کا پابند رہنا پڑے گا! اگر تم اجتماعی حیثیت سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے متفق ہو۔ اب اگر متفق ہونے کے باوجود بھی تم اس کی حدود سے نکلنے کی کوشش کرو تو تمھاری سزا موت ہی ہونی چاہیے۔"[۴۵]

اسی نوع کی بات وہ اپنے ناول "بھٹکی ہوئی لاش" میں لکھتے ہیں:

"یہاں ہر آدمی اپنی راہ کا کانٹا ہٹا دیتا ہے یہ ایک فطری بات ہے۔ کبھی اس فعل کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے اور کبھی اجتماعی۔ اجتماعی حیثیت کو ہم قانون کہتے ہیں۔"[۴۶]

قانون کے احترام کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے قارئین کو جرائم پھیلنے کا سبب اور اس کے سدباب کی مد میں فکری تربیت فراہم کی۔ معاشرے میں بڑھتے ہوئے جرائم پر فریدی اور کیپٹن حمید کی گفتگو:

"آخر یہ جرائم کیوں اتنے بڑھ گئے ہیں؟"

"جھگڑا بہت کی بنا پر۔" قریشی بولا۔

"میں نہیں سمجھا جناب"

"آبادی بڑھ گئی ہے۔ وسائل بھی محدود ہیں اور چند ہاتھوں پر ان کا قبضہ ہے۔"

"جھگڑا بہت والی بات تو رہ ہی گئی۔"

"اسی طرف آ رہا ہوں... دولت مندوں کو مزید دولت مند بننے کی آزادی ہے اور عوام کو قناعت پسندی کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔"

"ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے۔"

"چارہ ہی چارہ ہے۔ اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے۔ ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھگڑا بہت رفع ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ انھیں قناعت کا سبق پڑھانے کی بجائے ان کی 'خودی' کو ابھارا جائے جیسے بعض دوسرے ملکوں میں ہوا ہے۔"

"آپ تو انقلابی معلوم ہوتے ہیں۔"

"حدود اللہ میں رہ کر یقیناً انقلابی ہوں۔ حد بھی اس پر یہ ہم نہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کر لے۔" [۲۳]

ابن صفی اپنے ناول "خطرناک بوڑھا" میں اسی موضوع پر مزید بات کرتے ہیں:

"سنو حمید میں محض سراغ رسانی کی مشین نہیں ہوں۔ میری نظر انسانی کمزوریوں اور مجبوریوں پر بھی رہتی ہے۔ میں جب بھی کسی مجرم کو قانون کے حوالے کرنے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا اب ہمیں مجرموں سے نجات مل جائے گی۔ کیا مجرموں کو سزا دینے سے وہ وبا ہی مٹ جائے گی جس میں مبتلا ہو کر یہ پھانسی کے تختے کی طرف آتے ہیں۔ اب تک کروڑوں قاتل سزائے موت پا چکے ہیں لیکن کیا اب قتل نہیں ہوتے؟ کیا مجرموں کی تعداد کم ہو گئی ہے؟"

قریشی خاموش ہو گیا۔

"اس کا نہ تو ابھی تک کوئی حل دریافت ہوا ہے، نہ ہونے کی امید ہے۔" حمید بولا۔

"اس کا حل شروع ہی سے موجود تھا لیکن اس کی طرف کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ یا اگر دھیان دیا بھی گیا تو محض تفریح طبع کے لیے۔ ذہنی برتری ظاہر کرنے کے لیے۔ یہ حل محض کاغذوں اور تقریروں کی زینت رہا۔"

"تو آخر اس کا حل ہے کیا؟"

"مجرموں سے زیادہ برائی کی طرف دھیان دیا جائے۔ یہ سوچا جائے کہ آخر جرم کیے ہی کیوں جاتے ہیں۔ کیوں نہ سماجی زندگی کو اس معیار پر لایا جائے جہاں جرم کا سوال ہی نہ رہ جائے۔"

"مگر یہ کس طرح ممکن ہے" حمید بولا۔

"ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنی آسودگی کے لیے کرتے ہیں۔ اگر سوسائٹی میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن کے تحت ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے آسانی سے جائز طریقے اختیار کر سکیں تو پھر ہمیں انھی خواہشات کو آسودہ کرنے کے لیے ناجائز راستوں پر جانے کی ضرورت نہ پڑ سکے گی۔"

"یہاں۔۔۔ میں آپ سے متفق ہوں، لیکن ان حالات کا پیدا کرنا امر محال ہے۔"

"دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔۔۔ صرف عزم اور ہمت چاہیے۔" فریدی بولا۔[۳۸]

اسی موضوع پر وہ اپنے ناول "دہشت گر" میں کہتے ہیں:

"آخر یہ سب کب تک ہوتا رہے گا۔۔؟

جب تک اس نظام کی بنیادی خامیاں دور نہ کردی جائیں گی۔ ان کی طرف کوئی بھی دھیان نہیں دیتا۔ بس جمہوریت کے ڈھول پیٹے جاتے ہیں۔ شاید کوئی بھی نہیں جانتا کہ جمہوریت کس چڑیا کا نام ہے یا پھر اس کی طرف سے مصلحتاً ہی آنکھیں بند کر لی گئی ہیں۔ بنیادی چیز آدمی کا اپنے مقام کا عرفان ہے۔ جب تک

آدمی اپنا مقام نہیں پہچانے گا۔ کسی نظام کو طاقت سے نہیں چلا سکے گا۔" [۴۹]

جیسا کہ ابنِ صفی نے خود کہا ہے کہ حیات و کائنات کا وہ کون سا مسئلہ ہے جو میں نے اپنی کتابوں میں نہیں چھیڑا۔ اُن کے قارئین بھی اُن سے ہر قسم کے سوالات پوچھا کرتے تھے جن کا جواب وہ بھی "پیشرس" تو کبھی اپنے ناولوں میں دیا کرتے تھے۔ اسی طور کسی قاری نے اُن سے اُن کے پسندیدہ ازم کے بارے دریافت کیا تو انھوں نے اپنے ناول "دھواں ہوئی دیوار" میں اس کا یہ جواب دیا:

> "ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آپ سیاست میں کس "ازم" کے قائل ہیں۔
> ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ بے چارے دو صفحات آپ کے سوال کے جواب کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔ لیکن اگر آپ نے پبلک کے فائدے کے لیے یہ سوال کیا ہے تو مجھے عرض ہے کہ قریب قریب سارے ہی موڈرن "ازم" میرے مطالعے میں آ چکے ہیں لیکن میں قائل کسی کا بھی نہیں۔ میں تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں۔ اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جتنے پیٹ کا نشہ ہوا ویسا ہی بیان داغ دیا۔ آپ بھی کسی ازم وزم کے چکر میں پڑنے کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اسلام کے علاوہ سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں۔ اور کسی ایک ازم کی دشواری کسی زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا باعث بنتی رہی ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی ازم اپنے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلامی نظامِ حیات آج بھی قابلِ عمل ہے لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ہر آدمی کو ایمان دار بننا پڑے گا اور یہ بے حد مشکل کام ہے۔ لیکن اس مشکل کا بھی آسان ترین حل بعض یار لوگ یہ بتاتے ہیں کہ عبادت محمد رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر کرلو اور روٹی کے لیے کسی یہودی کے در پر ہاتھ پھیلانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن میرے بھائی میں روٹی بھی اسی اصول کے تحت چاہتا ہوں جس کے تحت عبادت کرتا ہوں۔
> پس میرا سیاسی رجحان اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام۔ اور میرا فن سکھاتا ہے قانون کا احترام۔" [۵۰]

آدمی اور آدمیت کی معراج پر وہ اپنے ایک کردار ڈاکٹر داور سے "پیاسا سمندر" میں کچھ ایسی باتیں

کہلواتے ہیں جو زمانۂ قدیم سے لے آج تک کے انسان کی بے کلی کی مکمل تصویر ہے۔ اسے ذہنی فرار کہیں
یا انسان کی فطری بے چینی جس کی بدولت اس نے چاند تاروں پر کمند ڈالی اور ہزارہا سائنسی ایجادات
کر ڈالیں:

"آدمی کتنا پیاسا ہے، اور کس طرح اس کی پیاس بڑھتی رہتی ہے، اور کس طرح وہ خارج میں اپنے لیے تسکین اور آسودگی تلاش کرتا ہے، مگر کیا کبھی بھی اسے تسکین نصیب ہوتی ہے؟ کبھی آسودگی ملتی ہے؟ مگر وہ بالکل کسی سمندر ہی کی موج در موج آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، کبھی چٹانوں سے ٹکراتا ہے، کبھی پہاڑوں میں رخنے کر کے ان کے پرخچے اڑا دیتا ہے، اپنی بے چینی کی وجہ وہ خود ہے، اور اپنی تسکین کا سامان بھی اپنے دامن میں رکھتا ہے، مگر وہ دوسروں کی پیاس تو بجھا دیتا ہے، خود اپنی پیاس بجھانے کا سلیقہ نہیں رکھتا۔۔۔ تم اسے پیاسا سمندر کہہ سکتی ہو بے بی۔۔۔ جو پانی ہی پانی رکھنے کے باوجود بھی ازل سے پیاسا ہے۔۔۔ اور اس وقت تک پیاسا رہے گا جب تک کہ اسے اپنا عرفان نہ ہو جائے، لیکن اس میں ہزارہا سال لگیں گے۔۔۔ ابھی تو بچوں کی طرح گھٹنوں چل رہا ہے۔۔۔ ابھی تو چاند پر جانے کی باتیں کر رہا ہے، اس کی ذہنیت اور سوجھ بوجھ اس بچے سے زیادہ نہیں ہے جو ماں کی گود میں چاند کے لیے ہمکتا ہے۔۔۔ وہ مصنوعی سیارے اڑا کر اس طرح خوش ہوتا ہے جیسے بچے صابن کے بلبلے اڑا کر مسرور ہوتے ہیں۔۔۔ اور ایک دوسرے سے شرط بدتے ہیں کہ دیکھیں کس کا بلبلا دیر تک ٹکا نہیں ہوتا، اور پھر ایسے شیخیاں بگھارتے ہیں جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، مگر بے بی۔۔۔ چاند کا سفر آدمیت کی معراج نہیں ہے۔۔۔ چاند کی باتیں تو ایسی ہی ہیں جیسے کوئی اپنے اصل کام سے اکتا جائے اور بیٹھ کر گنگنانا شروع کر دے۔۔۔ جانتی ہو آدمیت کی معراج کیا ہے؟۔۔۔ آدمی کی معراج یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہی مسائل حل کر لے۔۔۔ اگر اس نے مصنوعی سیارہ خلا میں پھینکنے کے بجائے سرطان کا کامیاب علاج دریافت کیا ہوتا تو میں سمجھتی کہ اب اس کے قدم اس راہ کی طرف اٹھ گئے ہیں جس کی انتہا اس کی

معراج ہوگی ، اگر اس نے چاند تک پہنچنے کی اسکیم بنانے کی بجائے زمین کے ہنگامے کو پرامن طور پر فرو کرنے کا کوئی ذریعہ دریافت کرلیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اب یہ پیاسا نہیں رہے گا، بلکہ خود کو بھی سیراب کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوچکی ہے۔ ۔ ۔ ہزارہا سال چاہئیں اس کے لیے بھی ہزارہا سال۔" [۵۴]

اپنی تحریروں میں ایک سے زیادہ دفعہ انھوں نے پوری قوم کو نہ صرف متحد ہونے کا درس دیا بلکہ بارہا اس بات پر زور دیا کہ بجائے مایوسی پھیلانے کے محنت اور یقین محکم سے اپنے حالات بدلیں:

"مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیجیے۔ دنیا کی کئی قومیں اس وقت کڑے آزمائشی دور سے گزر رہی ہیں۔ ایسے حالات میں صرف ثابت قدمی اور قومی یکجہتی برقرار رکھنے کی کوشش ہی ہمیں سرخ رو کر سکتی ہے۔ دشمن ایک بار پھر ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا ہوشیار رہیے۔ افواہوں پر کان نہ دھریے۔ قومی تعمیر نو میں پوری پوری ایمانداری سے حصہ لیجیے۔ اور اللہ سے دعا کرتے رہیے کہ وہ قوم کے معماروں کو فلاح کا راستہ دکھاتا رہے۔ ایک بار پھر گزارش کروں گا کہ دشمن کے ایجنٹوں کی پیشانیوں پر ان کے آقا کی مہر نہیں ہوتی۔ وہ صرف گفتار اور کردار سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ مایوسی پھیلانے والوں پر کڑی نظر رکھیے۔"

یہ ان نظریات کی ایک چھوٹی سی جھلک ہے جن کو پورا کرنے کی دھن میں ابن صفی ساری زندگی اپنے قلم کے ذریعے مصروف عمل رہے۔ اپنے ناولوں اور تحریروں کے ذریعے وہ حب الوطنی، قانون کا احترام، ہمدردی اور معیاری اردو سکھاتے رہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ایک مبصر اپنے زمانے، اپنے عہد سے آگے نکل کر سوچتا ہے۔ جناب ابن صفی کی تحریروں میں عصری معاملات بھی تھے اور عصر سے آگے نکلنے کے امکانات بھی۔ سائنسی نظریات ہوں یا فلسفے کی بحث ابن صفی کا قلم ہر موضوع پر لکھنے کا اہل تھا اور یہی علم و معلومات وہ اپنے قارئین میں منتقل کرنے کی کامیاب سعی کرتے رہے۔

ابن صفی کی جاسوسی دنیا

ابن صفی کے تخلیق کردہ ناول "دلیر مجرم" سے اردو میں جاسوسی ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ابن صفی خود اس ناول کی تخلیق کے بارے میں بتاتے ہیں:

"میرا پہلا ناول "دلیر مجرم" تھا۔ پہلا ناول تھا اس لیے کسی بیرونی سہارے کی
ضرورت تھی۔ لہٰذا اس کا مرکزی خیال مغربی ادب سے لیا گیا تھا۔ یہ ایک جرمن
مصنف کا کارنامہ تھا جس پر دنیا کے کئی مصنفوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثال
کے طور پر پیٹر شینی نے اسی پلاٹ کو سینٹرل ڈیزائن کے نام سے پیش کیا ہے۔
وکٹر گن نے یہی کہانی آئرن سائیڈس کے نام سے لکھی ہے۔۔۔وکٹر گن کا
انداز پیٹر شینی سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے مقابلے میں پیٹر شینی کا ناول کسی بچے
کا لکھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ پیٹر شینی وکٹر گن سے کہیں زیادہ مشہور
ہے۔ ہندی میں بھی آپ کو اسی پلاٹ پر ایک ناول "قیامت کی رات" کے نام
سے مل جائے گا۔ اس کے مصنف کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ہاں تو دلیر مجرم کا پلاٹ
میں نے انگریزی سے لیا تھا لیکن فریدی اور حمید میرے اپنے کردار تھے۔ میں
نے اس کہانی میں کچھ ایسی دلچسپیوں کا اضافہ بھی کیا ہے جو اوریجنل پلاٹ
میں نہیں تھیں۔" [۵۳]

"دلیر مجرم" کی اشاعت کے ساتھ ہی جاسوسی دنیا نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے۔ کیا زور قلم تھا کہ ابن صفی ہر ماہ ایک ناول مکمل کر لیا کرتے جو اسی ماہ سے میں شائع ہوتا تھا۔ یہ سال ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ اسی سال ابن صفی نے اپنی ہمشیرہ ریحانہ لطیف اور والدہ کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی۔ ہجرت تک آپ نے جاسوسی دنیا کے درج ذیل سات ناول مکمل کیے تھے:

٭ دلیر مجرم	مارچ ۱۹۵۲ء	٭ خوفناک جنگل	مارچ ۱۹۵۲ء
٭ عورت فروش کا قاتل	اپریل ۱۹۵۲ء	٭ تجوری کا راز	مئی ۱۹۵۲ء
٭ فریدی اور لیونارڈ	جون ۱۹۵۲ء	٭ پراسرار کنواں	جولائی ۱۹۵۲ء
٭ خطرناک بوڑھا	اگست ۱۹۵۲ء		

اگست ۵۲ء میں آپ نے ہجرت کی جس کی مختصر تفصیل ہمیں ہمشیرہ ابن صفی کی یادداشتوں سے ملتی ہے:

"جب ہم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تو بھائی جان جاسوسی دنیا کا ناول
"مصنوعی ناک" لکھ رہے تھے۔ جتنا لکھ چکے تھے حسینی صاحب کو دے آئے تھے

باقی یہاں سے بھیجا تھا۔"[۵۴]

ابن صفی نے جس سلسلے کا آغاز کیا اس نے جلد ہی مقبولیت کے وہ جھنڈے گاڑے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ "جاسوسی دنیا" کے متعلق ممتاز شاعر اور ادیب احمد صغیر صدیقی لکھتے ہیں:

> "جاسوسی دنیا ایک کتابی رسالہ نہ تھا۔ یہ تو ایک طوفان تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان کے ادبی حلقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس دور میں رکیک اور سطحی قسم کی کتابوں کی بڑی مارکیٹ تھی اور ابن صفی اس تحریک کے خلاف جہاد کے لیے آئے تھے۔ جاسوسی دنیا کے اجرا نے ان کتابوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر رکھ دیا۔ جاسوسی دنیا کے چند ہی ناول بازار میں آئے تھے کہ ابن صفی کا نام ایک طلسم کی طرح اذہان پر چھا گیا۔ ان دنوں پڑھنے پڑھانے کا رواج عام نہ تھا لیکن ابن صفی کے ناولوں نے ایسی دھوم مچائی کہ معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے ناول خریدنے لگے۔"[۵۵]

ابن صفی نے جاسوسی دنیا کے سلسلے میں کل ۱۲۵ ناول تحریر کیے۔[۵۶] بعض فہرستوں میں ان کی تعداد ۱۲۶ ہے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ڈاک کے تکلے کے ساتھ کسی تاخیر کی وجہ سے فروری ۱۹۵۶ء میں عمران سیریز کے سلسلے کا ایک ناول "بھیانک آدمی" شائع کرنا پڑا۔ اس ناول کو ملا کر ان کے ناولوں کی کل تعداد ۱۲۶ تک ہے۔ جاسوسی دنیا کے ابتدائی ۹۸ ناول ہندوستان سے عباس حسینی صاحب نے شائع کیے۔ ابن صفی انھیں کراچی سے مسودہ بھیجتے اور وہ الہ آباد سے اسے شائع کرتے۔ کراچی سے جاسوسی دنیا سیریز کے ناولوں کی اشاعت اکتوبر ۱۹۵۷ء سے شروع ہوئی۔[۵۷] جاسوسی دنیا سلسلے میں چند ناولوں میں مرکزی کردار انور اور رشیدہ نامی صحافی جوڑے نے بھی کیا۔ ان کہانیوں میں فریدی اور حمید نہیں تھے۔ ان ناولوں میں

☆ ہیرے کی کان فروری ۱۹۵۳ء ☆ تجوری کا گیت مارچ ۱۹۵۳ء
☆ آتشی پرندہ اپریل ۱۹۵۳ء ☆ خونی پتھر مئی ۱۹۵۳ء

شامل ہیں۔[۵۸] اس کے علاوہ دو کہانیوں "ساڑھے پانچ بجے" اور "پیش گوئی کا شکار" بھی انھی کرداروں پر مشتمل ہیں۔ جاسوسی دنیا سلسلے کی مکمل فہرست کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر ا کی صورت میں شامل کر دی گئی ہے۔

جاسوسی دنیا کے اہم کردار

ابن صفی نے جاسوسی دنیا میں چند مستقل کردار تخلیق کیے جن میں فریدی اور حمید مرکزی کردار تھے۔ ان کے ساتھ اکثر کہانیوں میں قاسم کا کردار بھی نظر آتا ہے۔ انور اور رشیدہ بھی کئی کہانیوں میں جلوہ گر ہوئے۔ ان کے تخلیق کردہ کرداروں کا مختصر تعارف:

احمد کمال فریدی

احمد کمال فریدی کا کردار پہلی بار "دلیر مجرم" کے ساتھ سامنے آیا۔ اس کردار کو اگر ابن صفی کا شاہکار قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فریدی کے والد نواب عزیز الدین خان ایک بہت بڑی ریاست کے مالک تھے جو ورثے میں فریدی کو ملی۔ نواب عزیز الدین خود بھی سیر و سیاحت اور مہم جو طبیعت کے حامل تھے۔ فریدی آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایک تعلیم یافتہ نابغہ ہے، جسے جرائم کا سدباب اور ان کی تہہ تک پہنچنے کا جنون ہے۔ اسی جنون کی وجہ سے اس نے انسپکٹر کا عہدہ سنبھالا ہوا ہے اور کئی دفعہ ترقی کی پیش کش ٹھکرا چکا ہے کیونکہ اسے سراغ رسانی کے عملی کام کا شوق ہے۔ بعض معاملات میں اسے صدر صاحب کی طرف سے خصوصی اجازت نامہ ملا ہوا ہے اور وہ انہیں ہی جواب دہ ہے۔

فریدی ایک وجیہہ، دراز قد، پرکشش شخصیت اور مضبوط جسم کا مالک ہے جس میں بے پناہ قوت پوشیدہ ہے۔ اس کے چہرے کی سب سے پرکشش چیز اس کی بڑی بڑی خوابیدہ آنکھیں ہیں جو بظاہر کچھ سوچتی محسوس ہوتی ہیں مگر وہ بہ وقت ایک مستعد اور چوکس ذہن کا مالک ہے، جس کی نظر ہر قانون شکن پر ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس کے کارناموں پر اسے عمر رسیدہ سمجھتے ہیں مگر اس کی عمر "دلیر مجرم" میں چھتیس برس بتائی گئی ہے۔ میک اپ کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فریدی ایک عمدہ اور جدید لیبارٹری کا بھی مالک ہے جہاں مختلف قسم کے تجربات اور یہاں تک کہ پوسٹ مارٹم بھی کیا جا سکتا ہے۔ فریدی حبس دم کا بھی ماہر ہے اور آدھ گھنٹے تک سانس روک سکتا ہے۔ وہ گولیوں سے بچنے کے فن سے بھی بخوبی واقف ہے۔ فریدی شہر کے مضافات میں ایک وسیع و عریض کوٹھی کا مالک ہے جس میں درجنوں کمرے، تہہ خانے اور اس کے عجائبات کے کمرے ہیں۔ اس کے عجائبات میں اس کا Dog House بھی ہے، جس میں درجنوں نایاب نسل کے کتے، اژدھے، سو کے قریب مختلف نسلوں کے سانپ اور ایک وسیع و عریض لائبریری ہے۔ فریدی کی گاڑیاں بھی شہر میں موضوع سخن ہوتی ہیں ان میں کیڈی لک، بیوک، لنکن اور آسٹن مارٹن کے جدید ماڈل شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے پاس ایک آرمڈ کار بھی موجود ہے جس میں

خاصی تعداد میں اسلحہ موجود ہے۔ ایک ناول "ساتواں جزیرہ" میں اس کی ذاتی کشتی کا ذکر آتا ہے۔ ساحل پر کئی بوٹ بھی اس کی ملکیت میں ہیں۔ فریدی مطالعے کا بہت شوقین ہے اور اپنا فارغ وقت مطالعے میں گزارتا ہے۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ اسے مختلف اقسام کے زہروں کی بھی مکمل معلومات ہیں۔ فریدی کئی زبانوں کا ماہر ہے جن میں انگریزی، عربی، فرانسیسی اور جرمن بھی شامل ہیں۔ اسے کئی اقسام کے رقص بھی آتے ہیں۔ پُراسرار خطوں کے بارے میں بھی کئی کتب اس کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اسے "جنگل کی آگ" نامی ناول میں ایک مجرم جے اللہ شاستری کے خطرناک منصوبے کو ناکام بنانے پر اعزازی کرنل کا عہدہ دیا گیا۔ کرنل فریدی ایک خفیہ تنظیم "بلیک فورس" کا بھی سربراہ ہے۔ یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا اسرار ہے جس کے متعلق اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ فورس خاص الخاص مواقع پر عمل میں آتی ہے اور بعض اوقات بین الاقوامی سطح پر بھی کام کرتی ہے۔ اپنی مضبوط قوتِ ارادی اور غیر جذباتی شخصیت پر اسے حمید نے "کرنل ہارڈ اسٹون" کا نام دیا ہے۔

کرنل فریدی کے کردار میں قاری کو بہت سی خوبیاں نظر آئیں گی۔ وہ ایک خاص نظم و ضبط کے تحت زندگی گزارنے کا قائل ہے جس میں جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں۔ قانون کا احترام، حب الوطنی، اچھے معاشرے کا قیام اس کی زندگی کے مقاصد میں سے ہیں۔ فریدی نہ صرف خود ابن صفی کا پسندیدہ کردار تھا بلکہ ایک دنیا اس کردار کی دیوانی تھی۔ کرنل فریدی کا ذاتی کردار اور خوبیاں اسے نطشے کا آہنی آدمی یا اقبال کا شاہین کے مماثل بنادیتی ہیں۔

کیپٹن حمید

ساجد حمید کرنل فریدی کا دست راست اور محکمے میں اس کے نائب کے طور پر کام کرتا ہے۔ فریدی جتنا سنجیدہ ہے حمید اتنا ہی شوخ، شرارتی، بظاہر لاپرواہ اور حد درجہ رومانوی طبیعت کا حامل ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بہادر، ذہین، کسی بھی خطرے میں بلا خوف و خطر کودنے والا بھی ہے۔ اسے شرلک ہومز کے ساتھی ڈاکٹر واٹسن سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ حمید جب کام کرنے پر آتا ہے تو بقول ابن صفی "اس کی کھوپڑی پر چنگیزیت سوار ہو جاتی ہے" اور وہ انجام سے بے پرواہ ہو کر بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے۔ وہ اکثر فریدی کے سامنے بچوں کی طرح حرکتیں کرتا نظر آتا ہے مگر کام کے وقت اتنا ہی چوکس بھی نظر آتا ہے۔ حمید صنف نازک کی صحبت میں رہنے کا بڑا شائق ہے۔ جس کسی میں اسے کوئی زنانہ صورت نظر آجائے اس میں دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم وہ صرف گپ شپ لگانے کا قائل ہے۔ حمید صاحب نے خوب صورت لڑکیوں

کا ایک بڑا ہی منظر دوام رکھا ہے۔ وہ انھیں "یا بلی" کہتے ہیں۔ اس نے ایک بکرا بھی پالا جو سولا ہیٹ پہنتا
تھا اور گلے میں بالی بھی لگاتا تھا۔ اس بکرے کا نام "بکرا خان" تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک سفید رنگ
کی چوہیا بھی پالی جو اس کی سیٹی کی دھن پر رقص کرتی تھی۔ جب فریدی کو اعزازی کرنل کا عہدہ ملا تو حمید کو بھی
"اعزازی کیپٹن" کا عہدہ ملا۔ ساجد حمید ابن صفی کے ان کرداروں میں سے ہے جس کے مفصل حالات
اسی کی زبانی ناول "ٹھنڈی آگ" میں بیان ہوئے ہیں۔ اس داستان میں جو حمید نے خود بیان کی ہے نہ
صرف اس کے مفصل حالات پتہ چلتے ہیں بلکہ جنگ کیا ہوتی ہے اور یہ انسانی زندگی پر کیا اثرات ڈالتی ہے
اس کی بھی تباہ کاریاں نظر ان کے سامنے عیاں ہو جاتی ہیں۔ آیئے حمید کی کہانی اسی کی زبانی سنیں:

"بہرحال بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنی کہانی خود ہی بیان کرنا چاہتا
ہوں۔ بچے سے حضرات یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں اور کرنل کب اور کن حالات میں
یک جا ہوئے تھے۔ جیسے پہلے بھی سن چکے ہیں میں نے بی۔ اے کیا تھا اور ایم اے
میں پڑھ رہا تھا کہ دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ میرے باپ ایک بہت بڑے
زمین دار اور تاج برطانیہ کے وفادار ترین لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے
گاؤں سے رنگروٹ بھرتی کرانے شروع کیے۔ وہ فخریہ لوگوں سے کہتے کہ وہ
حکومت کے اتنے وفادار ہیں کہ اس کی مدد کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک
بار کسی ہم قوم نے کہہ دیا کہ خان صاحب تمھارا بھی تو جوان بیٹا ہے، اسے فوج
میں بھرتی کرا دو۔ تب ہم دیکھیں گے کہ کتنے وفادار ہو۔ چناں چہ آ گیا جلال
خان صاحب کو اور مجھے اسی دن حکم دیا کہ میں کمیشن لے لوں۔ میں نے قسمیں
کھائیں کہ میں قطعی اس قابل نہیں ہوں۔۔۔۔ یقین نہ آئے تو استاد وحشی مراد
آبادی سے پوچھ لیجیے کہ میں نے حال میں شاعری شروع کی ہے۔ اور استاد
مین خاں سے ستار بجانا بھی سیکھ رہا ہوں۔ مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔
کمیشن لینا پڑا۔۔۔۔ جب تک کسی محاذ جنگ پر نہیں جانا پڑا دل کھول کر عیش
کیے۔ یقین کیجیے کہ کئی سال ادھر ادھر کیمپوں میں بسر ہوتی رہی اور میں دعائیں
مانگتا رہا کہ کسی طرح لڑائی ختم ہو جائے اور میں میدان جنگ کی صورت دیکھے
بغیر ہی غازی ساجد حمید بن جاؤں۔۔۔۔ مگر توبہ کیجیے ایک دن کھلونے بنانے والا

جاپان بھی جنگ میں کود پڑا اور مشرق بعید میں بھی محاذ جنگ قائم ہو گیا۔ بہر حال
مجھے تو اسی وقت یقین ہوا کہ کھلونے والا جاپان بھی جنگ میں کود سکتا ہے۔ جب
کہ میرے یونٹ کو مشرق کے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کیا جانے
لگا۔ گھروں میں بیٹھ کر جنگ کی خبریں سننا اور پڑھنا اور بات ہے لیکن آپ تصور
بھی نہیں کر سکتے کہ میدان جنگ کس چڑیا کا نام ہے۔ آپ کسی کی فتح اور شکست
پر بغلیں تو بجا سکتے ہیں لیکن شکست کھانے والے تو الگ رہے فتح مند فوجیوں سے
پوچھیے کہ ان پر کیا گزری ہے۔ کیا ان کے ہاتھ اس قابل رہ گئے ہیں کہ وہ بغلیں
ہی بجانے کے کام آسکیں۔

آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اب میں میدان جنگ کا نقشہ کھینچ کر آپ کو بور کروں گا۔ میں
بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایسا کیوں ہوں۔ میں ہر وقت قہقہے لگانا کیوں چاہتا
ہوں۔ مجھے ہر وقت تفریح کی تلاش کیوں رہتی ہے۔ میں اکثر سنجیدگی کے مواقع
پر بھی غیر سنجیدہ کیوں نظر آتا ہوں؟؟ ۔ ادھر دیکھیے ذرا میری پچھلی زندگی میں
جھانکنے کی کوشش کیجیے۔

میں، جس نے شاعری شروع کی تھی۔۔۔ میں جو آزمنگ خیالات رکھتا تھا۔ میں
جس نے ستارے دیکھنا شروع کیا تھا، زبردستی جنگ کے میدان میں دھکیل دیا گیا۔
میں نے طالب علمی کی زندگی میں کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں
ایک فوجی بنوں گا (یہ اور بات ہے کہ فلمی ہیرو بننے کے خواب میں نے بکثرت
دیکھے ہوں) ہاں تو بالکل غیر متوقع طور پر اور دل پر جبر کر کے میں نے یہ لائن
اختیار کی تھی۔ اگر نہ کرتا تو میرے والد صاحب اپنی دھمکی کے مطابق نہ زندگی بھر
میری شکل دیکھتے اور نہ میری شادی بھمن پور کے جاگیردار کی لڑکی سے ہو سکتی جو
مجھے بہت اچھی لگتی تھی کیوں کہ بڑوں کی لڑکی ہی ہوتی ہے بڑ کی نہیں۔ رہا اچھی لگنے
کا سوال تو کچھ دنوں کے بعد بیوی اچھی لگنے لگتی ہے خواہ وہ کونتار کا پیا ہی کیوں
نہ ہو۔ میں دراصل صرف ایک بات سے ڈرتا تھا۔۔۔ وہ صرف اتنی سی تھی کہ اگر
جیب خرچ بند ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔ والد صاحب کچھ ایسے ہی آدمی تھے جو کہتے

کر گزرتے تھے۔ بلکہ پہلے کر گزرتے تھے پھر کہتے تھے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کشت و خون قتل و غارت گری نے میری زندگی میں مایوسیاں بھر دیں۔ میں بے تحاشا شراب پینے لگا تھا اور عورتیں میری زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئی تھیں۔ آپ یقین کیجیے کہ میں اتنا بدنام ہو گیا تھا کہ سزا کے طور پر میرا عہدہ گھٹا دیا گیا تھا۔ یعنی سیکنڈ لیفٹیننٹ سے سارجنٹ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ کیوں کہ میری ٹانگ سے ضرب نکال کر اسے زیادہ دن داخل کے ٹھکانے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اسی دوران میں سنگاپور میں تین لڑکیاں آ ٹکرائیں۔ اتفاق سے وہ جاپانی جاسوس تھیں ان کا راز اتفاقاً مجھے معلوم ہوا۔ اس میں میری کوششوں کو دخل نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے ملٹری کی سیکرٹ سروس میں لے لیا گیا۔ مگر عہدہ وہی رہا سارجنٹ۔ ان لڑکیوں کے ذریعے ایک بہت بڑے گروہ کی گرفتاری عمل میں آئی جو منظم طور پر جاپان کے لیے کام کر رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں کے بعد جنگ ختم ہو گئی اور مجھ جیسے ہزاروں تیس مار خان غازی کہلائے۔

لیکن یقین کیجیے کہ میں پھر گھر واپس نہیں گیا۔ سنگاپور سے واپسی پر میرے ایک شناسا نے جو میرے ہی گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اپنی اور میری واپسی کی اطلاع اپنے گھر والوں کو دی تھی۔ والد خان جن سے عرصے سے خط و کتابت بند تھی اس اطلاع پر مجھے ریسیو کرنے دوڑے آئے۔ مگر میں نے انھیں نہیں پہچانا۔ پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ان کی آنکھیں تو بہت سے چھلکی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا کہ میں نے انھیں اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں انھوں نے خوامخواہ میرا باپ بننے کی کوشش کی تو میں ان کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دوں گا۔ والد خان اس پر بغلیں جھانکنے لگے۔ یقیناً یہ ان کے لیے ایٹم بم سے کم کسی طرح نہ رہی ہوگی۔۔۔ آپ مجھے ذلیل کہیں گے۔۔ لیکن میری بھی سنیے۔۔۔۔ والد خان کو کیا حق حاصل تھا کہ مجھے اپنی آن پر بھینٹ چڑھا دیں۔ مجھ میں اس وقت اتنی کمزوری تھی کہ میں صرف والد خان ہی کو ان کا ذمہ دار تصور کرتا تھا۔ یہ سوچتا تھا کہ اگر انھوں نے اپنی پٹھانی آن کے مقابلے میں میری نافرمانی کو کمتر سمجھا تو مجھے

در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ میں ایک بہت بڑی جائیداد سے
بھی محروم ہو جاؤں۔ مگر اب تو میری دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میں ایک ہولناک
جنگ دیکھ چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ آدمی کتنا بے وقعت جانور ہے۔ وہ گرتی
ہوئی عمارتوں کے نیچے دب کر کس طرح چیختا اور کراہتا ہے۔ وہ کس طرح چوہے
دان میں پھنسے ہوئے چوہوں کی مانند بے بسی سے مر جاتا ہے۔ میں نے کیا نہیں
دیکھا تھا۔۔۔ سب کچھ دیکھا تھا۔۔۔ اور جو کچھ بھی دیکھا تھا اس کی پرچھائیاں
میرا مستقبل بننے والی تھیں۔ اور مستقبل میری نظروں میں کیا تھا۔ ایک بے کراں
تاریکی۔۔۔ ایک ابدی سناٹا۔ جس کے تصور ہی سے ذہن شل ہو کر رہ جائیں۔
خیر ختم کیجیے اس مشک سی بکواس سے میں آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا۔

ہاں تو جب والد خان میرے باپ ہونے پر مصر تھے اور میں اس کی تردید کر رہا
تھا۔ میری نظر ایک آدمی پر پڑی جو بہت دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔
یہ ایک وجیہہ اور تیم شیم نوجوان تھا۔ شخصیت ایسی پرکشش تھی کہ دوسری بار دیکھنے
کو بھی دل چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب تھیں بڑی بڑی چمکیں اور اس طرح
پیچھی آ رہی تھیں جیسے وہ اس جگہ کھڑے کھڑے سو جائے گا۔ جیسے ہی ہماری
آنکھیں چار ہوئیں اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی اور وہ
مسکراہٹ بھی ایسی ہی تھی جیسے وہ مجھ سے واقف رہا ہو۔ مجھے شرارت سوجھی
۔۔۔ والد خان سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتا تھا جو جان کو آ گئے تھے۔۔۔ بس
یوں ہی خواہ مخواہ میں بھائی جان کہہ کر اس آدمی کی طرف لپکا۔ لیکن میری حیرت
کی انتہا نہ رہی جب اس نے جیتے رہو۔۔۔ خوش رہو۔ کہہ کر مجھے بھینچ لیا۔ اور
پھر میری پیٹھ ٹھونک کر بولا ارے منے تو تو ایک دم جوان ہو گیا ہے۔ والد خان
قریب ہی کھڑے آنکھیں مل مل کر ہم دونوں کو گھور رہے تھے۔ مجھے حیرت ضرور
تھی اور میں اس آدمی کے رویے پر الجھن میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ یقین
تھا کہ اب والد خان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ یہی ہوا۔۔۔ والد خان جھینپتے
ہوئے انداز میں آگے بڑھے اور آہستہ سے بولے معاف کیجیے گا مجھے غلط فہمی

ہوئی تھی مگر میرا لڑکا آپ کا ہم شکل ہے۔
ہو سکتا ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ اس آدمی نے لاپروائی سے کہا اور واحد خان اپنے دوستوں سمیت وہاں سے چلے گئے۔

اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف چلنے لگا۔ میں بھی تن بہ تقدیر چلا جا رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن سے باہر آ کر اس نے ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموش رہا کہتا بھی کیا۔ اس نے جس انداز میں اس مذاق کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا، اپنی مثال آپ تھا۔ اور اسی وقت میں نے سوچا کہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ ستم ظریف لوگ کم نہ ہوں گے۔ کار تیز رفتاری سے شہر کی سڑکیں ناپ رہی تھی اور ہم دونوں خاموش تھے ویسے میں بار بار آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورتا۔۔۔ اور سوچتا کہ وہ آخر گونگا کیوں ہو گیا ہے۔ آخر گاڑی ایک عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ یہ کوٹھی بہت بڑی اور شاندار تھی۔ اس میں پائیں باغ کے ساتھ ہی ساتھ ٹینس پارک بھی تھا اور اس کے گرد ہزاروں مربع گز کا احاطہ تھا۔ میں نے سوچا یا خدا اصلی باپ تو اس حیثیت کا نہیں تھا مگر نقلی بھائی۔ نقلی بھائی مجھے ایک شاندار کیڈیلاک کار میں یہاں تک لایا تھا۔ میں چپ چاپ تک رہا تھا۔ ہم پلٹ بھی نہ چڑھ سکا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ملازم سے کہہ رہا تھا۔ انھیں باتھ روم وغیرہ دکھاؤ اور ان کا سامان مہمان خانے میں پہنچا دو۔ اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کون تھا۔ آج کا کرنل فریدی جو اس وقت انسپکٹر فریدی کہلاتا تھا۔ مگر ایک انسپکٹر کے یہ ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ یہ آدمی آخر کتنا بڑا راشی اور اسے کتنی رشوت ملتی ہے۔ کیا حکام بالا کو اس ٹھاٹھ باٹ کی خبر ہی نہیں ہے۔ شام تک میں نے کرنل سے سچی بات کہہ دی۔ وہ سن کر کافی محظوظ ہوئے لیکن انھوں نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنے باپ سے ملنا چاہیے یا میں نے غلطی کی ہے۔ میرے سامنے مستقبل کے لیے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں تو ان دنوں خود کو قدیم یونان کے فرقہ کلبیہ کا

ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ خود کرنل ہی نے میرے سامنے مستقبل کے لیے ایک پلان رکھا۔ ان کا خیال تھا چوں کہ میں ملٹری کی سکیورٹی سروس سے منسلک رہ چکا تھا اس لیے ان کے محکمے میں میرے لیے ضرور گنجائش نکل آئے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے اسسٹنٹ سب انسپکٹر کا رینک مل گیا۔ لیکن ملٹری کے عہدے کے مطابق میں سارجنٹ حمید ہی کہلاتا رہا۔ کرنل نے مجھے شروع ہی سے اپنی ماتحتی میں رکھا تھا۔ ملازمت ملنے کے بعد ہی میں نے ایک علاحدہ مکان کرایہ پر حاصل کر لیا اور وہیں رہنے لگا۔ لیکن زیادہ دنوں تک ایسا نہیں ہو سکا۔ کرنل نے مجھے مجبور ہی کر دیا کہ میں رہوں بھی ان کے ساتھ۔ اور پھر اس کے بعد کی زندگی سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ ایک بار کرنل ہی مجھے میرے گھر لے گئے تھے۔ اور والد خان نے اس سلسلے میں بہت بڑا جشن برپا کیا تھا۔ صلح صفائی ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اب گھر بار سے طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ میری کایا پلٹ گئی۔ میں کرنل کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے مجھے آدمی بنا دیا۔ غالباً اسی لیے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ میری اصلاح کے لیے ایسے نفسیاتی پہلو اختیار کرتے کہ مجھے بھی خبر نہ ہوتی۔ شراب چھوٹی اور ان مایوسیوں کے تانے بانے میرے ذہن سے غائب ہوئے جن کا تعلق مستقبل سے تھا۔ مگر صرف ایک بات پر آج تک ان سے متفق نہ ہو سکا وہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں رہی ہاں۔۔۔ وہی لڑکیوں والا معاملہ۔۔۔ اور یہ بھی سن لیجیے اپنے قلم سے اس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے شرم نہیں آتی۔ شرم یوں نہیں آتی کہ آج تک میرے قدم دوستی سے آگے نہیں بڑھے۔ میں لڑکیوں میں بیٹھ کر گپیں مارنے کا شائق ہوں مگر ان سے عشق نہیں ہو جاتا۔'' [۵۹]

قاسم رضا

قاسم ایک انجانی جسم اور طویل قامت شخص ہے جو نظر تا بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح ہے۔ اس کے والد خان بہادر عاصم ایک بہت بڑے صنعت کار ہیں جو ملک کی بہت بڑی کمپنی "عاصم ٹیکسٹائل" کے

مالک ہیں۔ قاسم کا کردار پہلی بار "برف کے بھوت" نامی ناول میں متعارف ہوا۔ حمید نے جب اسے پہلے پہل دیکھا تو اس کی طاقت دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ قاسم نے سڑک پر سے چلتی ہوئی موٹر سائیکل کو اس کے سوار سمیت ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا۔ اس کی سادہ لوحی دیکھ کر اس نے قاسم سے دوستی کر لی۔ قاسم بھی حمید کی طرح تتلیوں کی صحبت کا بڑا شائق ہے اور تندرست و توانا خواتین اس کی کمزوری ہیں۔ والد نے اس کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کر دی جو انتہائی دبلی پتلی عورت ہے۔ اپنی بیوی کو "چپاتی بیگم" کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک ناول میں حمید اس پر عورت کا میک اپ کر دیتا ہے جس کا تصور ہی انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اس کی ذہنی رجحانوں میں بدل جاتی ہے اور اسی رو میں کئی الفاظ بھی تبدیل کر دیتا ہے جیسے کہ کوئی پر ہنسنا یا زکوٹ۔ ناقابل یقین حد تک خوش خوراک اور بھوک کی ذرا بھی سہار نہیں رکھتا۔ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر کئی ناولوں میں مجرموں نے اغوا کر کے یا دھوکے سے بلا کر مزدوروں کی طرح کام بھی لیتے رہے ہیں۔ ناول "زمین کے بادل" میں اس کی علی عمران سے ملاقات ہوتی ہے تو علی عمران اسے اپنا "خالہ زاد" بتاتا ہے جو قاسم کی زبان میں "خالہ جاد" ہے۔ قاسم کا کردار جاسوسی دنیا میں بہت ہی شوخ رنگوں کا حامل ہے جو ناول میں مزاح کے رنگ بکھیر دیتا ہے۔

انور رشید

انور، رشیدہ کی جوڑی فریدی اور حمید کی طرح سرکاری جاسوس نہیں، بلکہ ایک ایسی جوڑی کا نام ہے جو صحافت سے وابستہ ہے۔ مگر کرنل فریدی انور اور رشیدہ کی بے خوفی، ذہانت اور کردار دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انھیں مختلف کیسوں میں استعمال بھی کرتا ہے۔ ابن صفی اپنے ناول "ہیرے کی کان" میں انور کا تعارف کچھ یوں کرواتے ہیں:

> "ایک بے پرواہ اور اکھڑ نوجوان تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک وکیل کی حیثیت سے شروع کی تھی لیکن کچھ دنوں بعد سب کچھ چھوڑ کر وہ اس راستے پر آ نکلا تھا۔ اسے دراصل کارناموں سے پیار تھا۔ پچھلی زندگی قطعی ناخوش گوار گزری تھی، اس لیے وہ ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اب تو وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا...... وہ ایک اخبار میں تیز قلم کا مالک تھا اور اسی اخبار میں قسط وار جاسوسی ناول لکھا کرتا تھا۔ صحیح معنوں میں اخبار کا سب کچھ وہی تھا۔ اگر وہ

ادارے سے الگ ہو جاتا تو دوسرے دن ہی اخبار کی تعداد اشاعت آدھی سے
بھی کم رہ جاتی ......وہ ایک کامیاب جاسوس بھی تھا۔"[۹۰]

"تجوری کا گیت" نامی ناول میں ابن صفی نے انور کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"انور کے کردار میں عجیب و غریب بات یہ تھی کہ وہ کسی کو معاف کرنا تو جانتا ہی
نہ تھا۔ اس کا فلسفۂ حیات انتقام تھا......وہ بہت زیادہ دوراندیشی کا قائل نہیں
تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حادثے کا مقابلہ صرف حاضر
دماغی سے کیا جا سکتا ہے۔ منطقی دلائل اور دوراندیشی فضول چیزیں ہیں۔
دوراندیشی غلط راستے پر بھی لے جا سکتی ہے۔"[۹۱]

ناول "بھیانک جزیرہ" میں ابن صفی نے انور کے متعلق حیرت انگیز انکشاف کیے ہیں۔ کہانی
کا ایک کردار اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"میں تم دونوں کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔"
"ہونہہ!" انور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "تم میرے متعلق کیا جانتے ہو؟"
"سنو گے!" البرٹو نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا سنو! تم نواب وجاہت علی خاں کے لڑکے
ہو۔" انور بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر البرٹو کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"تمھارے چچا شجاعت علی خاں نے تمھیں اپنے بھائی کی ناجائز اولاد ثابت
کرا کے ان کے ترکے سے محروم کر دیا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تمھار
ی ماں ان کی بیوی تھی......مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ
تمھاری زندگی کا یہ حادثہ تمھیں غلط راستوں پر لے گیا۔ تمھاری نظر میں یہ عظیم
کائنات اور اس میں متحرک زندگی محض ایک ڈھکوسلا اور بے معنی چیز بن کر رہ
گئی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"[۹۲]

رشیدہ

رشیدہ کا تعارف ابن صفی خود کچھ اس طرح کرواتے ہیں:

"رشیدہ اسی (انور) کے دفتر میں وابستہ تھی۔ وہ نہ جانے کیوں انور کے اس
قدر قریب آ گئی تھی۔ ان دونوں کے ذہنیت بھی برابر ہی برابر واقع تھے۔ صرف

درمیان میں ایک دیوار حائل تھی۔ رشیدہ بھی اسی کی طرح دنیا میں تنہا تھی۔ اس نے اپنے متعلق اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔ سچ تو یہ ہے کہ انور نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ ان دونوں میں دو چیزیں مشترک تھیں۔ پہلی یہ کہ دونوں اس وسیع دنیا میں تنہا تھے۔ دوسری یہ کہ دونوں کارنامے پسند کرتے تھے۔ دونوں دلیر تھے۔ دونوں کو پرانے سماج سے نفرت تھی۔ متوسط طبقے کی صاف ستھری لیکن گھناؤنی زندگی ناپسند تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دونوں قریب ہو گئے تھے۔۔۔۔ وہ دونوں اکثر آپس میں الجھ جاتے تھے اور یہ لڑائی کچھ اتنی تلخ ہوتی کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ اب وہ ایک دوسرے سے زندگی بھر نہیں بولیں گے لیکن ان کا یہ عہد زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوتا اور پھر ایک دوسرے سے بولنے پر مجبور ہو جاتے۔ نہ جانے کیوں؟ صرف ایک بات پر رشیدہ انور سے بہت زیادہ نالاں رہا کرتی تھی۔ وہ یہ کہ انور فضول خرچ تھا اور جب مفلس ہو جاتا تو کبھی گھڑی بیچی جاتی، کبھی انگوٹھی اور کبھی ردی کاغذ۔ ادھار لینے کا عالم تھا لیکن پیسا ملتے ہی سب سے پہلے پچھلا قرض بے باق کرنے کی فکر کرتا تھا۔"[۲۳]

ابن صفی نے "رشیدہ" کا تفصیلی تعارف "بھیانک جزیرہ" نامی ناول میں کچھ تفصیل سے کرایا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک غیر معروف جزیرے کی فرد تھی اور اس کا نام "سینورا دسوتی" تھا۔ فریدی کے شہر میں اسے پرورش کے لیے رکھا گیا تھا۔ دراصل وہ "جزیرہ وین آئی لینڈ" کی ولی عہد تھی۔ اس جزیرے کے اصولوں اور روایتوں کے مطابق اس کے ولی عہد کی تربیت باہر کی دنیا میں کی جاتی تھی۔ بچپن میں ہی اس کے بازو اور سینے پر داغ کر شاہی نشان ڈال دیا جاتا تھا تاکہ اس کی شناخت آسانی ہو سکے۔ نیز اس کی موجودگی کا علم چند لوگوں کو ہی ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ جزیرے میں پہنچایا جاتا تو "فاگان یا فاگانیہ" کا لقب اختیار کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لیتا تھا۔ "بھیانک جزیرہ" ناول کے مطابق رشیدہ کسی دوسری کو بادشاہت سونپ کر انور کے ساتھ واپس آجاتی ہے۔

عمران سیریز

پاکستان آنے کے تین برس بعد جب برصغیر میں ابن صفی کو مستند جاسوسی ناول نگار اور انگریزی زبان میں Best Seller مان لیا گیا تو انھوں نے اپنا مشہور زمانہ کردار "علی عمران" تخلیق کیا۔ کردار کیا

تخلیق کیا، ایک نئی دنیا تخلیق کی جس کی جھلک دیکھتے ہی ایک عالم اس کا دیوانہ بن گیا۔ جلد ہی ان کے قارئین کے دو گروہ بن گئے ایک فریدی کے پرستاروں کا گروہ اور دوسرا عمران کے چاہنے والوں کا۔ عمران سیریز نے سری ادب میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ نہ صرف ابن صفی کی زندگی میں بلکہ آج تک ان کے کرداروں کی نقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ فریدی جتنا سنجیدہ ہے عمران اتنا ہی شوخ۔ فریدی باقاعدہ ایک محکمے کا ملازم ہے جبکہ عمران بظاہر بے روزگار ہے مگر وہ ملک کی سیکرٹ سروس کا سربراہ ہے۔

ابن صفی نے عمران سیریز میں کل ۱۲۰ ناول تحریر کیے۔[۶۴] ان میں چار ناول متفرقات کے زمرے میں آتے ہیں جو اخبارات و جرائد میں قسط وار شائع ہوئے۔ اپنے ناول "بے آواز سیارہ" جو مارچ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا اور وہ شیزوفرینیا میں مبتلا ہوئے اور اس سلسلے کا آخری ناول "ڈیڑھ متوالے" انھوں نے صحت یابی کے بعد ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا۔ الہ آباد ہندوستان میں 'ڈیڑھ متوالے' کی تقریب رونمائی میں ۲۵ نومبر ۱۹۶۳ء کو اس وقت کے وزیر اعلیٰ بہادر شاستری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی جب کہ اس کے دوسرے ایڈیشن کی تقریب رونمائی ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اتر پردیش کے وزیر قانون و انصاف سید علی ظہیر (معروف ترقی پسند ہندوستانی ادیب سید سجاد ظہیر کے بھائی) کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔[۶۵] ان کا ناول "ڈاکٹر دعا گو" ۱۹۶۳ء کے اواخر میں روزنامہ "حریت" میں شائع ہوا تھا۔ عمران سیریز کے تمام ناولوں کی فہرست کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر ۲ کے عنوان سے دی گئی ہے۔ عمران سیریز کے کرداروں کا مختصر تعارف پیش ہے:

علی عمران

علی عمران اپنے تمام تر جلوؤں کے ساتھ اگست ۱۹۵۵ء میں "خوفناک عمارت" میں طلوع ہوئے۔ اس کے والد جناب کرم رحمان انٹیلیجنس محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ وہ ایک سخت گیر طبیعت کے حامل ہیں جن کی موجودگی میں کوئی بھی چوں کی آواز بھی نہیں نکالتا۔ وہ ایک با اصول شخص ہیں، جو بے اصولی کسی بھی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔ مختلف ناولوں میں انھیں عمران کے وارنٹ نکالتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ عمران کی والدہ روایتی ماؤں کی طرح اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہیں۔ علی عمران کی ایک چھوٹی بہن ثریا ہے جو اسے چٹکیوں میں اڑا کر رکھتی ہے۔ علی عمران آکسفورڈ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے اور سائنس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتا ہے۔ اپنے لندن میں قیام کے دوران اسے سکاٹ لینڈ یارڈ کے سربراہ کے گھر رہنے کا موقع ملا جو اس کے والد کے دوست تھے۔ اسی زمانہ میں اس نے ایک

اپ اور دوسرے فنون سیکھے۔ لندن قیام کے دوران اس نے ایک بہت بڑے گروہ سمگلرس کا خاتمہ کیا اور اسی دوران میں اس کی ملاقات بدنام زمانہ چینی سنگ ہی سے ہوتی ہے۔ اپنے زرخیز دماغ کی بدولت وہ اس کا گولیوں سے بچنے کا آرٹ جسے "سنگ آرٹ" کہا جاتا ہے، سیکھ جاتا ہے۔ اگلی ملاقاتوں میں سنگ ہی اسے بھتیجا کہنا شروع کر دیتا ہے۔

علی عمران ایک انتہائی خوش رو اور وجیہہ شخصیت کا حامل ہے اور اکثر چہرے پر حماقت طاری رکھتا ہے۔ مگر بڑا بیدار مغز اور چست و چالاک ہے۔ وہ اکثر احمقانہ کپڑے پہنتا ہے جس سے اس کے والد بھی زچ ہو جاتے ہیں۔ یہ لباس گلابی کوٹ، سبز پتلون، زرد ٹائی، سپید پتلون اور سرخ گلاب پر مشتمل ہے جسے وہ "تیکھی لہر" لباس کہتا ہے۔ وہ ایک ٹو سیٹر گاڑی کا مالک ہے۔ اس کی شخصیت کے کئی روپ ہیں اس کا کردار بڑا پیچیدہ اور پرت دار ہے۔ وہ ایک تیز دماغ رکھتا ہے اور اپنی حاضر دماغی سے اسے بدلتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ اس میں صنف مخالف کے لیے بڑی کشش ہے جبکہ وہ ایک اعلیٰ کردار کا مالک ہے جو ضرورت کے تحت تو ان کے قریب ہو جاتا ہے مگر اس کے علاوہ اسے صرف اور صرف اپنی مٹی سے محبت ہے۔ لوگ اسے ایک غیر متوازن طبیعت کا حامل سمجھتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ابن صفی نے خود ہی عمران کے کردار کے متعلق بنیادی تفصیلات اور اس کے مزاج کی غیر ہمواریوں کا تذکرہ اپنے ایک ناول "ڈاکٹر دعاگو" میں کیا ہے۔ اس اقتباس سے نہ صرف عمران بلکہ اس کے والد، سر سلطان اور ماتحتوں کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں:

> "لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ عمران کی شخصیت اتنی غیر متوازن کیوں ہے؟ وہ ہر معاملے کو ہنسی میں کیوں اڑا دیتا ہے؟ والدین کا احترام اس طرح کیوں نہیں کرتا جیسے کرنا چاہیے؟
>
> اس کے پیچھے بھی ایک طویل کہانی ہے۔ بچپن میں ماں اسے نماز روزے سے لگا جاتی تھی۔ باپ نے ایک امریکی مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ باپ سخت گیر آدمی تھے اپنے آگے کسی کی نہ چلنے دیتے جب تک گھر میں رہتے۔۔ سناٹا چھایا رہتا۔۔۔ لوگ اتنی آہستگی سے گفتگو کرتے کہ قریب سے ہی سنی جا سکتی تھی۔ عمران بچپن سے ہی دوہری زندگی گزارنے کا عادی ہوتا گیا۔ باہر کچھ ہوتا تھا اور گھر میں کچھ۔۔۔ اس کے باپ جیسے جیسے ترقی کرتے گئے سخت گیری بھی

بڑھتی گئی۔

مشن سکول اور گھریلو تربیت کے تضاد نے اسے بچپن سے ہی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

ماں کہتی اللہ ایک ہے۔ نہ اسے کسی نے جنا اور نہ کوئی اس سے جنا گیا۔

مشن سکول کہتا عیسیٰ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔

بچپن ہی سے ذہین تھا۔ سکول میں بحث کرنا چاہتا یا ماں کے اقوال دہراتا تو ڈانٹ کر چپ کرا دیا جاتا۔ گھر پہ عیسیٰ مسیح کی بڑائی بیان کرتا تو ماں تھپڑ رسید کر دیتی۔ باپ کو ان فروعات سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ان کا قول تھا کہ میں مسلمان ہوں تو بیٹا بھی ہر حال میں مسلمان ہوگا۔۔!

نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹا چوں چوں کا مربہ بنتا گیا۔ تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے تک نہ اسے عیسیٰ مسیح سے کوئی دلچسپی رہی اور نہ اس سے کہ اللہ واحد ہے یا اس کے دو حصے دار اور بھی ہیں۔ ہر چیز کا مضحکہ اڑا دینے کی عادت پڑتی جا رہی تھی۔

آئی سی ایس کرنے کے بعد لندن کے لیے رخت سفر باندھ گیا۔ وہاں رحمان صاحب کے ایک انگریز دوست کے ہاں قیام ہوا۔ ان پابندیوں سے نجات ملی جن میں اب تک گزر رہی تھی بس پھر کیا تھا کھل کھیلا۔۔۔۔۔ شاید ہی کوئی خانہ چھوڑا گیا ہو۔ انگریز میزبان پولیس آفیسر تھا۔ کہا کرتا تم بھی تو محکمہ سراغ رسانی کے آفیسر کی اولاد ہو۔ کچھ نہ کچھ تو جراثیم ورثے میں ملے ہی ہوں گے۔ کریمنالوجی کا بھی مطالعہ کرو۔ کبھی مشق کے لیے ایک آدھ کیس بھی لا دیتا۔ اس چکر میں پڑنے کے بعد ہر قسم کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا۔۔۔۔۔ اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ وقت کافی تھا۔ دو سال بی ایس سی کے دو سال ایم ایس سی کے اور پھر ڈاکٹریٹ کے لیے ریسرچ کا وقفہ۔۔!

بہر حال وہ لندن سے سوفیصدی "ناکارہ" بن کر واپس آیا۔ رحمان صاحب کو علم ہی نہیں تھا کہ صاحبزادے سائنس کے ڈاکٹر ہونے کے علاوہ کریمنالوجی کے بھی ماہر بن کر تشریف لائے ہیں۔۔ انھوں نے اسے یونیورسٹی میں پڑھانے

کو کہا لیکن عمران نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا۔۔۔لڑکے پڑھا سکتا ہوں بوڑھے مجھ سے نہیں پڑھائے جائیں گے۔

رحمٰن صاحب کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس بے تکلفانہ انداز میں نافرمانی کرے گا۔۔ بہت بھنائے۔ گرجے برسے بھی۔۔ لیکن وہ تو یورپین سائل کا تکلف ریز کر واپس آیا تھا ذرہ برابر پروا نہ کی۔ کچھ دنوں بعد محکمہ سراغ رسانی کے سپرنٹنڈنٹ کیپٹن فیاض سے یارانہ ہو گیا اور اس نے مذاق ہی مذاق میں بعض کیسوں میں اس کی راہنمائی کی۔۔۔ بس پھر کیا تھا۔ فیاض کی بن آئی۔ بعض حیرت انگیز طور پر اس کی سروس بک میں کارناموں کا اضافہ ہونے لگا۔ نہ جانے کتنے ناقابل حل معمے آئینہ ہو گئے اور محکمے میں کیپٹن فیاض کا طوطی باقاعدہ بولنے لگا۔ پھر کچھ دنوں بعد عمران بعض آفیسروں کی نظر میں آ گیا۔۔۔ اور آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کی حیثیت سے اس کا تقرر براہ راست سی بی آئی کے محکمے میں ہو گیا۔ رحمٰن صاحب اب ڈائریکٹر جنرل تھے۔ منظوری کے لیے کاغذات ان کے سامنے پہنچے تو بہت بگڑے۔ لیکن چونکہ وزارت داخلہ کی طرف سے سفارش تھی اس لیے مجبوراً تقرری کی منظوری دینی پڑی ویسے وہ متحیر ضرور تھے کہ ایسا کیوں کر ہوا۔
پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ اوپر پروا کیے بغیر انہیں عمران کو الگ ہی کر دینا پڑا۔ ہوا یہ کہ شاداب نگر میں ایک نامعلوم سمگلر نے بڑا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مرکز سے کئی آفیسر شاداب نگر بھیجے گئے لیکن ناکام واپس آئے۔ آخر کار عمران کی باری آئی تو اس نے بڑے دھڑلے سے اس سمگلر اور اس کے خطرناک گروہ کا قلع قمع کیا۔
لیکن رحمٰن صاحب کو عمران کا طریقہ کار پسند نہ آیا۔ فرمانے لگے۔ یہ سراغ رسانی نہیں کھلا ہوا غنڈہ پن ہے۔ لہٰذا یا تو قاعدے سے کام کرو ورنہ استعفیٰ دے دو۔ عمران اور قاعدے کی باتیں؟ وعدہ نہ کر سکا اس لیے استعفیٰ دینا پڑا۔ شاداب نگر سے ایک اینگلو برمیز لڑکی روشی بھی عمران کے ساتھ آئی تھی اس لیے گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ رحمٰن صاحب بھلا اس کا وجود کیوں کر برداشت کرتے۔
کیپٹن فیاض نے کئی متروکہ فلیٹوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ عمران نے دھونس دھڑلے

سے کام لے کر ایک فلیٹ کی کنجی حاصل کی اور روشی سمیت وہیں جم گیا۔ سراغ رسانی کا مکمل تجربہ تو تھا ہی۔ لہٰذا پرائیویٹ سراغ رسانی کی ٹھہری۔ لیکن اپنے یہاں پرائیویٹ سراغ رسانی کے لیے قانوناً کوئی جگہ نہ تھی لہٰذا دفتر پر فارورڈنگ اینڈ کلیئرنگ ایجنسی کا بورڈ لگانا پڑا۔ جس کا مفہوم عمران کی لغات میں "شادی اور طلاق" تھا۔۔ اشہر میں ان دنوں خاندانی جھگڑوں کا موسم تھا۔ طلاق کے اتنے کیسز آئے کہ نپٹانا مشکل ہو گیا۔ روشی اس کی پارٹنر کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اسی دوران میں وزارت خارجہ کے سیکرٹری سر سلطان جو عمران اور اس کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، ایک بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ وہ ان کا ایک نجی معاملہ تھا جس کی تشہیر ان کی بدنامی کا باعث بنتی۔۔ عمران ان کی مدد کرتا ہے اور اس خوبی سے اس کیس کو نپٹا کر اصل فتنے کا سر کچل دیتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر سر سلطان مجبور کرتے ہیں کہ وہ محکمہ خارجہ کی سیکرٹ سروس کی سربراہی قبول کر لے۔ بہرحال کچھ دنوں بعد وہ سیکرٹ سروس کا چیف بن گیا۔ اس کے ماتحت اسے ایکس ٹو X-2 کے نام سے جانتے تھے۔ طرفہ تماشا تھی اس کی شخصیت بھی۔ عمران کی حیثیت سے وہ سیکرٹ سروس کا ایک معمولی ایجنٹ اور انفارمر تھا۔ اس کے ماتحت اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جب وہ ایکسٹو X-2 کی حیثیت سے انھیں فون پر مخاطب کرتا تو ان کا دم نکل جاتا۔ فون پر اس طرح مودب ہو جاتے جیسے وہ سامنے موجود ہو۔ ایکس ٹو کو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور دل میں اسے دیکھ لینے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ لیکن جب وہ بحیثیت عمران ان سے مل بیٹھتا تو وہ اسے چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کرتے۔

صرف ایک ماتحت ایسا تھا جو اس کی دونوں حیثیتوں سے واقف تھا وہ بلیک زیرو تھا اور اس کے دوسرے ماتحتوں کو علم نہیں تھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور بھی ایکس ٹو کا ماتحت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ عمران کی عدم موجودگی میں ایکس ٹو بن کر ماتحتوں کو کنٹرول کرے۔ ماتحتوں میں ایک سوئس لڑکی جولیانا فٹز واٹر Juliana Fitzwater بھی تھی۔ تنویر، چوہان، صفدر، نعمانی اور خاور براہ راست ماتحتی

> سیکرٹ سروس سے آئے تھے۔ بہر حال وہ نہیں جانتے تھے کہ عمران ہی ان کا
> چیف آفیسر ہے۔ انہیں صرف اس کا علم تھا کہ ان کا چیف کبھی کبھی عمران سے بھی
> کام لیا کرتا ہے۔ عمران کی رہائش اب بھی اسی فلیٹ میں تھی۔ اس کے دو ملازم
> بھی ساتھ ہی رہتے تھے سلیمان اور جوزف۔ سلیمان بھی عمران کی محبت میں رحمٰن
> صاحب کی ملازمت چھوڑ آیا تھا۔ جوزف نیگرو تھا۔ ایک اعلیٰ درجے کا لڑاکا۔
> ایک مقدمے میں سلطانی گواہ بن کر رہا ہوا تھا پھر عمران ہی سے لپٹا رہ گیا تھا۔
> اس کا قول تھا کہ عمران سے زیادہ شاندار مالک اس زمانے میں ملنا بے حد
> مشکل ہے۔ ظاہر ہے چھ بوتلیں یومیہ کون پلا سکتا۔ وہ ہر وقت نشے میں ڈوبا رہتا
> تھا۔ لیکن نشے میں بھی کسی شکاری کتے ہی کی طرح خطرے کی بو سونگھتا تھا اور اس
> طرح چاق و چوبند نظر آنے لگتا تھا جیسے کبھی پی ہی نہ ہو۔۔۔ اور ثریا کبھی کی فلیٹ
> چھوڑ گئی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ کچھ دنوں بعد عمران باقاعدہ طور پر اس پر
> عاشق ہو جائے گا اور پھر شادی۔۔۔ عمران اور عشق۔۔۔؟ تصور ہی مضحکہ خیز
> ہے۔ بہر حال وہ اس کی تلون طبعی کی متحمل نہ ہو سکی اور اسے رہائش کے لیے الگ
> انتظام کرنا پڑا۔ ویسے تعلقات اب بھی اچھے ہی تھے اور عمران کبھی کبھی اس سے
> بھی کام لیتا تھا (روشی، سر سلطان اور بلیک زیرو کے علاوہ وہ واحد فرد تھی جو یہ جانتی
> تھی کہ عمران ایکس ٹو ہے)۔ سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر شہر کی مشہور عمارت دانش
> منزل تھی۔ لیکن اس کی اصل حیثیت سے محکمہ خارجہ کے سیکرٹری (سر سلطان) اور
> سیکرٹ سروس کے ممبران کے علاوہ اور کوئی واقف نہیں تھا۔" [۹۹]

ابن صفی اردو کے وہ واحد ادیب ہیں جن کے تخلیق کردہ کرداروں کی نقالی ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ ابن صفی نے دو کردار ایسے تخلیق کیے تھے جو انھوں نے باقاعدہ تمام ناولوں کو پیش کر کے متعارف کروائے۔ یہ دونوں کردار پہلی بار "جاسوسی میں پیچ" نامی ناول میں سامنے آئے۔ ان کا مختصر تعارف:

ظفر الملک اور جیمسن (اصل نام جمشن)

ظفر الملک نواب مظفر الملک کا بھتیجا تھا جسے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا گیا۔ وہاں سے اس نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی مگر پٹنی بن کر لوٹا۔ جیمسن اس کے خادم خصوصی کی حیثیت

سے ساتھ روانہ کیا گیا مگر اس نے بھی اس فیصلے کو قبول کیا اور اپنے مالک کے ساتھ ہی ساتھی بن کر واپس
آیا۔ گھر واپس آتے ہی اپنے چچا سے جھڑپ ہوئی اور اسے ٹھسی سمیت گھر سے نکال دیا گیا۔ اسی
دوران اس کی مڈبھیڑ عمران سے ہو جاتی ہے جو اس میں اپنی مماثلت دیکھ کر اسے اپنے ساتھ کام کرنے پر
مائل کر لیتا ہے۔ ظفر الملک حلیے اور مزاج کے اعتبار سے عمران کا چربہ تو محسوس ہوتا ہے۔ "خطائی ہنگامہ"
نامی ناول میں وہ عمران کا کردار ادا کرتا ہے۔ ٹھسی بھی اسی کی طرح انجام سے بے پروا دن گزارتا
ہے۔ اسے اردو کلاسیکی ادب سے گہری دلچسپی ہے اور اکثر وہ بے محل جملے اور اشعار دہراتا ہے۔ عمران
ان دونوں کو مختلف کیسز میں استعمال کرتا رہا ہے۔ دونوں کی جوڑی بہت پسند کی گئی اور ان کی آپس کی
گفتگو مزاح کا عمدہ نمونہ ہے۔

ابن صفی کی تخلیقات میں طنز و مزاح

طنز اور مزاح زبان و ادب کے دو رنگ ہیں جو نظم و نثر دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ اردو ادب
میں طنز و مزاح کو عموماً یکساں معنوں میں لیا اور اکثر استعمال کیا جاتا ہے حالاں کہ طنز اور مزاح میں فرق
ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر ایک دوسرے سے ایسے ملے ہوتے ہیں کہ ان
کو الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ مزاح کا انگریزی مترادف Humour ہے جو لاطینی کے لفظ
"Humere" سے مشتق ہے جس کے معانی ہیں مرطوب ہونا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ "مضحکہ خیز یا ظریفانہ"
کا مترادف ہو گیا۔ طنز انگریزی لفظ Satire سے نکلا ہے جس کے لغوی معانی پھلوں سے بھری طشتری
کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر دیکھا جائے تو اس سے مراد دوسری صدی قبل مسیح میں لاطینی زبان میں شروع
ہونے والی شاعری ہے جسے Satire کہا جاتا تھا۔ رشید احمد صدیقی طنز کے متبادل لفظ کے بارے میں
لکھتے ہیں:

> "طنز (Satire) کا جو مفہوم انگریزی میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی
> ہمارے یہاں کے کسی ایک لفظ میں تقریباً ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں
> اس موقع پر چند الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ہجو و ہجا، ہجو ملیح، تعریض،
> تنقیص، لعن و طعن، طعن و طنز، استہزا، مذمت، مضحکات، مطائبات، ہجو و ہزل
> وغیرہ ہیں۔" [۹۶]

اردو ادب میں طنز و مزاح کا آغاز آج سے ساڑھے تین سو سال قبل جنم لینے والے میر جعفر زٹلی نے

کیا۔ اردو کے اس اولین مزاح نگار کو رواج بہت سے جنم لینے والی احمقانہ داستانوں کا یہ "قصہ کشی" کی حیثیت
تک جا دیا گیا۔ مزاح کا مقصد تفنن طبع ہے اور طنز کا مقصد افراط و تفریط میں توازن اور تناسب پیدا کرنا،
مزاح میں زندہ دلی اور رحم کا جذبہ کارفرما ہے جب کہ طنز میں جوش، رنج اور بے چینی کا دخل ہوتا ہے۔
طنز و مزاح کوئی علاحدہ صنف سخن نہیں۔ شگفتہ نگاری کے بنیادی دھارے دو ہیں یعنی طنز اور مزاح لیکن
جس طرح انسانی شکلیں مختلف ہیں اس طرح ان کے اندازِ بیاں کی صورتیں بھی مختلف ہیں یہ سب کی سب
صورتیں طنز و مزاح کی تخلیق پر منتج ہوتی ہیں۔

اردو نثر میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز خطوطِ غالب سے ہوتا ہے جنھوں نے اپنی ذاتی و معاشرتی
شکستہ حالی کے باوجود معاشی کوائف قرینے سے ظرافت کا لطف اٹھایا کہ بر عظیم کی بے آب و گیاہ زندگی
سے رنگا رنگ شگوفے پھوٹتے دکھائی دینے لگے۔ تقسیم کے بعد چند برس تک اردو مزاح پر زوال کا عالم طاری
رہا۔ یہ سکوت ساٹھ کی دہائی میں ٹوٹا جب اردو مزاح کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ۱۹۶۱ء میں مشتاق احمد یوسفی کی
پہلی تصنیف "چراغ تلے" سے ہوا جس نے طنز و مزاح کا اپنے قارئین سے رشتہ دوبارہ جوڑ دیا۔ طنز و مزاح
ادب کی کسی صنف کا نہیں بلکہ ایک رجحان اور وصف کا نام ہے۔ ادبا نے تقریباً ہر صنف میں حسبِ موقع و
استطاعت اسے برتا ہے۔ اردو نثر میں طنز و مزاح جن اصنافِ ادب میں نظر آتا ہے ان میں افسانہ،
ناول، مضمون، ناٹک، پیروڈی، فینٹسی، آپ بیتی، سوانح، خاکہ، سفرنامہ، خطوط اور روزنامچے شامل ہیں۔

یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ابن صفی مزاح نگاروں کی کسی بھی فہرست میں نظر نہیں آئیں گے۔
حالاں کہ دو مزاحیہ ناول اور طنز و مزاح کے تین مجموعوں کے باوجود بھی کسی ناقد نے ان کی خدمات پر نظر
نہیں ڈالی۔ حالاں کہ ابن صفی نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز طنزیہ اور مزاحیہ کہانیاں اور کالم لکھنے
سے کیا۔ ان کے قریبی دوست مجاور حسین رضوی کے مطابق وہ جاسوسی دنیا لکھنے سے پیشتر سو سے زائد
طنزیہ اور مزاحیہ کہانیاں اور کالم لکھ چکے تھے۔ ابن صفی اپنی کتاب "ڈپلومیٹ مرغ" کے حرفِ آغاز میں
اس بارے میں خود لکھتے ہیں:

> "طنز و مزاح میرا فن نہیں بلکہ کم زوری ہے۔ کم زوری اس لیے کہ صاحبِ اقتدار
> نہیں ہوں۔ صاحبِ اقتدار و اختیار ہوتا تو میرے ہاتھ میں قلم کی بجائے ڈنڈا
> نظر آتا اور میں طنز کرنے کی بجائے ہڈیاں توڑتا دکھائی دیتا۔"[۹۹]

اسی دیباچے میں آگے چل کر اپنی کتاب کا مقدمہ خود لکھنے کی وجہ بھی بتاتے ہیں اور اپنے ساتھ

ہونے والی ناانصافی کی طرف بھی مبہم سا اشارہ کرتے ہیں:

"اس مجموعے کا مقدمہ "کسی اور" سے لکھوایا جائے۔ میں نے کہا بھائی بحیثیت جاسوسی ناول نگار میں خود ہی ان اصناف ادب کے لیے "کوئی اور" بن سکتا ہوں لہٰذا مجموعے کے "مقدمے" کے لیے بھی دنیائے ادب کے اسی "دس نمبری" کی خدمات حاصل کیجیے۔ کسی شریف آدمی کی "بے عزتی خراب کرانے" سے کیا فائدہ۔ اگر کسی صاحب نے ازراہ مروت کچھ لکھ بھی دیا تو اپنے حلقے میں بسور بسور کر کہتے پھریں گے "یار کیا بتاؤں فلاں صاحب سر ہو گئے تھے۔۔۔ لکھنا ہی پڑا۔۔۔ بھلا میں۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔" [۶۹]

ابن صفی کا مزاح بڑا شستہ اور طنز گہری کاٹ رکھتا ہے۔ ایک ایک لفظ بڑا اپنا تُلا اور اپنی جگہ پر نگینے کی طرح جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے مزاح کی آڑ میں قہقہے اور چٹکلے نہیں، تفنن۔ مسخرے نہیں اڑاتے بلکہ گفتگو اور تبصرے سے بھی اشارتاً اور کبھی کنایتاً بات کیے جاتے ہیں۔ کسی جگہ ان کا لہجہ تند مگر اکثر بڑا دھیما رہتا ہے۔ ان کی پہلی مزاحیہ کہانی "محبت" میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کا نام "فرار" تھا۔ یہ کہانی ایک دھوبی کے گدھے اور کتے کے درمیان گپ شپ پر مبنی ہے جس میں ساتھ ساتھ دوسرے جانور جیسے مچھر اور بھینسیں بھی ان سے بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پوری کہانی میں آپس کی بات چیت میں ایسا طنز پیش کیا گیا ہے جس کی کاٹ بڑی دیر تک محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر گدھا ایک موقع پر کتے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"مطلب صاف ہے ہماری قوم بہت ہی امن پسند ہے۔ ایک گدھا آج تک کسی دوسرے گدھے کے لیے مہلک ثابت نہیں ہوا۔ اور نہ کبھی کسی گدھے نے بھی کوشش کی کہ دوسروں پر اپنی برتری کا رعب ڈالے۔ ہم سب بڑی محنت کے عادی ہیں۔ ہم سب برابری اور بھائی چارے کے قائل ہیں۔ ہم سب وہی کھاتے ہیں جو ایک کھاتا ہے۔ ہم سب کڑی محنت کے عادی ہیں۔ اونچ نیچ کے جراثیم سے ہماری قوم ہمیشہ پاک صاف رہی ہے۔۔۔" [۷۰]

جواباً کتا اسے کیا کہتا ہے ملاحظہ فرمایئے:

ذرا ٹھہرو! کتے نے بار بار اپنی آنکھ پر حملہ کرتی ایک مکھی کو ہڑپ کرتے ہوئے کہا،

> آخر اس لیکچر کا مطلب۔۔۔ تم ہمیشہ سے چھیڑ چھیڑ کر رو تے چلے آئے ہو۔۔۔
> ان ساری باتوں کا مفہوم سوائے میری قوم کی تذلیل کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے
> تسلیم ہے کہ میری قوم ان تمام خوبیوں کے بالمقابل نقائص کی حامل ہے مگر تمہیں
> یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم اس کے لیے مجبور ہیں۔ کچھ قدیم روایات اور کچھ
> تقاضائے فطرت کی بنا پر ہم آج تک اپنی ان عادات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔۔۔
> تکلف برطرف سچ پوچھو تو یہ عادات ہمارے لیے باعث فخر ہیں۔ باعث فخر اس
> لیے کہ یہ نظام فطرت کے عین مطابق ہیں۔ کیوں کہ نظام قدرت ہی ہمیں
> "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا سبق دیتا ہے۔ رہا بھائی چارے والا معاملہ تو یہ
> سب بناوٹ اور مجبوریت ہے۔ اس قسم کا کوئی نظام بھی دیرپا ثابت نہیں ہوا جو نظام
> قدرت کے خلاف ہو۔ بھائی چارہ قسم کی تحریکیں، عارضی اور وقتی ضرورت کی
> ایجاد ہیں۔"[۱۵]

گدھے اور کتے کی آپس کی گفتگو کیا ہمارے معاشرے کی عکاسی نہیں۔ یاد رہے کہ یہ سن ۱۹۴۸ کی تحریر ہے جس میں ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا۔ ابن صفی نے اس وقت ہی اس تحریک کی حقیقت بیان کر دی تھی۔ ویسے تو مزاح اور طنز ان کی سبھی تحریروں میں نمایاں ہے مگر ان کی کچھ تخلیقات اس ضمن میں اس درجے پر ہیں کہ انھیں اردو طنز و مزاح میں شہ پاروں کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ابن صفی نے "پرنس چلی" نامی ناول میں طنز اور مزاح کا ایسا کرشمہ دکھایا جو بہت نایاب ہے۔ چلی دراصل کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ایک کیفیت ہے جو کسی پر بھی طاری ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں وہ خود اس ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں جو خود بھی ان کے مزاح اور ان کی مزاح پر گرفت کا نمونہ ہے:

> "چلی کی تاریخ شاید اتنی ہی پرانی ہے جتنی تہذیب کے ارتقا کی۔ چلی ہر دور اور
> ہر طبقے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ پرنس چلی سے لے کر شیخ چلی تک۔ پتھر کے
> زمانے سے لے کر خلائی دور تک چلیوں کی بھرمار نظر آئے گی۔ تخت سلطنت پر
> متمکن ہو کر عالم بالا کی فرماں روائی تک کے خواب دیکھ ڈالتا ہے اور شیخ چلی
> کی حیثیت میں انڈے سے ابتدا کر کے مرغی کے انڈے سے بھی ہاتھ دھوتا
> ہے۔ کچھ بھی ہو "غیر چلیوں" کے لیے تفریح کا سامان ضرور بنتا ہے۔ خواہ

عقابوں کی بے وفائی کی بنا پر افراسیاب کی طرح تخت سمیت عرش سے فرش پر سر کے بل پر آپڑے، خواہ خیالی اولاد کو جھڑکتے وقت سر سے گھی کا ہنڈا گر جائے۔ چلی نہ ہوتے تو انسانی تاریخ بالکل سپاٹ ہوتی۔ نہ جنگیں ہوتیں اور نہ طوائف الملوکی فروغ پاتی۔ نہ عروج ہوتا نہ زوال ہوتا۔ دنیا اتنی بارونق ہرگز نہ ہوتی اور مختلف قسم کے چلی اس لیے سردھڑ کی بازی نہ لگاتے۔ چلی ایک معیار ہے ایک پیمانہ ہے۔ کسی عاقل ترین آدمی کے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی پوری زندگی کا تجزیہ کر ڈالیے اور پھر تھوڑی پر انگلی رکھ کر بیٹھے سوچا کیجیے "یار یہ بھی تو چلی ہی تھا"۔ "چلیت" ایک آفاقی حقیقت ہے۔ ہم سب چلی ہیں۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ خود کو اس بھیڑ سے الگ کر کے تفریح کے لیے دوسرے چلیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگر میری بات پر یقین نہیں تو ذرا ایک نظر اپنے ہوائی قلعوں پر بھی ڈال لیجیے، پھر تخت کے پائے سے بندھے ہوئے عقاب دھوکا نہ دے جائیں تو میرا ذمہ۔ اگر گھی کا ہنڈا سر سے نہ گر جائے تو میں جواب دہ۔ غرض کہ

ہم بھی چلی، تم بھی چلی، چلی ہے جگ سارا"[۴۲]

ابنِ صفی کے مزاح پارے سے تعلق رکھنے والے پروفیسر فیض تجیس کہتے ہیں:

"اگر ہم ان کا موازنہ اگاتھا کرسٹی سے کریں تو ابنِ صفی کی کتابوں میں دو اہم پہلو ایسے ہیں جو اگاتھا کرسٹی میں نہیں ہیں۔ ایک تو طنز و مزاح، میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو ان کی زبان رواں ہے، دوسری بات یہ کہ انھوں نے ایسا کارنامہ انجام دیا جو شاید کسی اور نے انجام نہیں دیا، وہ یہ ہے کہ انھوں نے مزاح اور سسپنس کو یک جا کیا۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر لوگ مزاح لکھتے ہیں تو اس میں سسپنس نہیں ہوتا یعنی سسپنس اور مزاح کا ایک ساتھ ہونا میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ عموماً مزاح لکھتے وقت سسپنس ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ ہم یہ لکھنے لگتے ہیں کہ یہ مذاق ہی مذاق ہے، جب کہ ابنِ صفی کے ہاں یہ دونوں ساتھ ہیں۔ یہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔"[۴۳]

اب مزید اس بارے میں بات کرنے کی بجائے ان کی تحریروں سے طنز و مزاح کے نمونے ملاحظہ فرمائیں اور خود فیصلہ کریں کہ وہ کس پائے کے مزاح نگار تھے۔ کتابوں پر انعام کس طرح دیے جاتے ہیں آپ بھی دیکھیں:

"ہمارے ہاں تو کتابوں کو ترازو میں تول کر سال کی بہترین کتابیں منتخب کی جاتی ہیں اور ان پر انعامات دیے جاتے ہیں۔ عموماً سب سے زیادہ ضخیم کتاب کا مصنف انعام پاتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کر بیٹھے تو کہہ دیا جاتا ہے۔ اماں اتنی موٹی کتاب لکھ دی ہے، بے چارے نے، کہیں نہ کہیں تو کوئی قابل انعام بات قلم سے نکل ہی گئی ہوگی۔ آپ اس ترقی کے دور میں مطالعہ لیے پھرتے ہیں..... لاحول ولا قوۃ.....۔" [۷۴]

ان سطور میں چھپا طنز.....

"اگر میں اس سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو تم مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے ہیں۔ انھیں اعزاز ملتے ہیں، ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں۔" [۷۵]

"ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے تجربات ان کی سمجھ سے باہر تھے کہ ایک آدمی جب پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں اور جب کوئی قوم پاگل ہو جاتی ہے تو "طاقت ور" کیوں کہلانے لگتی ہے؟" [۷۶]

"اپنے وجود کے ثبوت کے لیے میں ڈیکارٹس کے خیال سے متفق ہوں۔ یعنی میرا ادراک میرے وجود کا ثبوت ہے ---- اور میرا وجود کسی کی حماقت کا نتیجہ ___ ۔لہٰذا حماقت ہی بنیادی حقیقت ٹھہری ---- دنیا کے سارے فتنوں کی جڑ تو عقل ہے۔ اس لیے عقل کو اٹھا کر طاق پر رکھ دینا چاہیے۔ جیسے میں نے رکھ دی ہے۔" [۷۷]

"شہنشاہیت میں تو صرف ایک نالائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جمہوریت میں نالائقوں کی پوری ٹیم وبال جان بن جاتی ہے۔" [۷۸]

درج ذیل اقتباس ان کی تحریر "ڈیڈ میٹ مرغا" کے دو کرداروں مرغا اور ہیرو کے درمیان ایک

ہکانہ ہے جس میں انھوں نے جمہوریت کی اتنی منفرد تشریح کی ہے کہ ہم بھی اس کی داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے:

"اچھا چلو۔ یہی بتا دو کہ تم مرغا کیوں بن گئے ہو۔

سیاست کے چکر میں پڑ کر مرغا بنا ہوں۔

کیا مطلب۔

شیخ صاحب کی سیاسی بصیرت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔

میں نہیں سمجھا۔

بات یہ ہے کہ ہماری مملکت میں بھی جمہوریت کی باتیں ہونے لگی ہیں۔

یعنی جناتوں میں۔۔۔۔

ہاں ہاں کیوں نہیں لہٰذا شہنشاہ جنات یعنی میرے والد حضور چاہتے ہیں کہ عوامی لیڈر بھی شاہی خاندان ہی کے کسی فرد کو بننا چاہیے۔

خدا کی پناہ۔ میں کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ یعنی کہ جناتوں میں بھی ڈیموکریسی پہنچ گئی ہے۔

اس پر مرغے نے تضحیک آمیز لہجے میں ایک قہقہہ لگایا۔ دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔

اے بے وقوف آدم زاد کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ڈیموکریسی آدمیوں نے پیدا کی ہے۔

یقیناً میں نے سینہ تان کر کہا۔۔۔۔

تمھارا یہ یقین جہالت پر مبنی ہے۔

تم بکواس کر رہے ہو مجھے بھی غصہ آ گیا۔

اچھا اب اپنے علم میں اضافہ کرو۔ وہ نرمی سے بولا۔ ڈیموکریسی کا بانی میری قوم کا ایک فرد تھا اور اس نے ڈیموکریسی کی بنیاد اس وقت ڈالی تھی جب آدم کے خاکی پتلے میں جان بھی نہیں پڑی تھی۔

شاید تم سیاست کے ساتھ ہی تاریخ بھی بگاڑ رہے ہو۔ میں نے ہنس کر بولا۔

جہلا کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔

معلم الملکوت عزازیل قوم جنات ہی کا ایک فرد تھا۔ جو آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بنا

پر شیطان الرجیم قرار پایا تھا۔

چلو تسلیم۔۔۔۔۔ اچھا تو پھر۔

ڈپلومیسی کا بانی اور خالق وہی شیطان الرجیم تھا۔ سجدے سے انکار اس لیے کیا تھا
کہ خاک کے پتلے کو حقیر سمجھتا تھا۔ لیکن اللہ پاک کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی
کہ وہ معبودِ اعظم ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا۔"

میں اچھل پڑا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔۔۔۔۔ ڈپلومیسی کا صحیح مفہوم ہی اس
وقت سمجھ میں آیا تھا۔"[۹۷]

ابن صفی کے "پیشرس" بھی مزاح کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ انھیں ان کے معیار کی روشنی میں مزاح میں اعلیٰ درجہ دیا جا سکتا ہے۔ "پیشرس" دراصل رابطے کا ایسا ذریعہ تھا جس کی بدولت ابن صفی اور قارئین بالواسطہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ مختلف قارئین کی آرا اور تجاویز زیر بحث لائی جاتیں، اہم اعلانات کیے جاتے۔ ان میں ایک ایسی ادبی چاشنی تھی کہ ابن صفی کے "پیشرس" مزاح میں ایک علاحدہ دبستان کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے مزاح کا ایک نمونہ ان کے ایک پیشرس سے:

"دشواری یہ آپڑی ہے کہ اب آپ نے "پیشرس" کے دل چسپ ہونے پر بھی
زور دینا شروع کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں بعد فرمائیں کہ کتاب کا پہلا
اور دوسرا صفحہ بھی دل چسپ ہونا چاہیے۔ وہ بڑی کٹھن منزل ہوگی۔ آپ خود
سوچیے کہ میں ان دونوں صفحات کو کیسے دل چسپ بنا سکوں گا۔ مگر نہیں ٹھہریے، میں یہ
کوشش کروں گا۔۔۔۔ مثلاً (پہلا صفحہ)

☜ عمران سیریز کا خاص تحیر خیز اور قہقہہ انگیز ناول۔۔۔۔ مزہ نہ آئے تو
ایمان دھرم سے لکھ دینے پر آدھی قیمت واپس۔

☜ خدا کی قسم اس ناول کا نام "قاصد کی تلاش" ہے۔

☜ مصنف ابن صفی (بی۔ اے) کے نام چھپلے صیت۔۔۔۔ خدا رحم
کرے اس ذہنیت پر۔

☜ دفتر اس کھیت میں پایا جاتا ہے جہاں آدمیوں کی کاشت ہوتی ہے،
مزید آسانیوں کے لیے قبرستان بھی قریب ہے۔

☚ جملہ حقوق بالکل محفوظ ہیں۔۔۔ اگر یقین نہ آئے تو دفتر آ کر زبانی پوچھ جائیے، آمد و رفت کا کرایہ ہمارے ذمہ۔

☚ بھارت میں حقوق اشاعت عباس حسینی صاحب کے نام محفوظ ہیں۔ یقین نہ آئے تو انھیں ایک بے رنگ خط بھیج کر دریافت کر لیجیے اور اس وقت تک بے رنگ خطوط بھیجتے رہیے جب تک جواب نہ آ جائے۔

☚ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہا جاتا ہے کہ اس ناول کے نام، مقام، کردار اور کہانی سے تعلق رکھنے والے اداروں کے نام قطعی فرضی ہیں۔ اگر اس حلفیہ بیان پر آپ کو یقین نہ آئے تو صبر کیجیے۔

☚ قیمت ایک روپیہ سے ایک پیسا کم نہ ہوگی۔ چونی کا پھیر ہے بور نہ کیجیے۔

☚ زر سالانہ مع رجسٹری فرق مبلغ گیارہ روپے۔ لائبریریوں سے مبلغ پانچ روپے زائد یعنی سولہ روپے کیوں کہ لائبریری والے ایک روپیا سے نہ جانے کتنے روپے بنا لیتے ہیں۔

☚ ممالک غیر سے ستر و شلنگ (ہمیں نہیں معلوم کہ ایک روپے میں کتنے شلنگ ہوتے ہیں۔ اس لیے اندازے سے ستر و شلنگ لکھ دیے جاتے ہیں)۔

☚ بے چارے ابن صفی پبلشر (شامت اعمال سے) نے دفتر سے فلاں پریس تک کئی روز جوتیاں چٹخانے کے بعد یہ بزار دقت چھپوایا اور فلاں فلاں مقام سے رو رو کر شائع کیا۔۔۔ رویا اس لیے کہ ہر جزو کا ایک آدھا صفحہ خراب ہوا نظر آیا۔ پریس والوں سے شکایت کی تو بولے کتابت درست نہیں تھی۔ کاتب سے کہیے کہ گاڑھی روشنائی استعمال کرے۔ کاتب تک ان کا پیغام پہنچایا تو بڑی تند نظروں سے بولے کہ ارے، آپ اس پریس میں چھپواتے ہیں، وہاں تو ساری مشینیں چوپٹ ہیں، میں اتنی گاڑھی روشنائی استعمال کرتا ہوں کہ اگر آپ کے چہرے پر اس کا پلاسٹر کر دیا جائے تو کم از کم چھ ماہ تک آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔"[۸۰]

ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں کی نقالی ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ نقالی کے ساتھ ساتھ ان کے ناولوں کو نہ صرف اردو زبان میں بلکہ سندھی، گجراتی، ہندی اور بنگلہ میں ترجمہ کیا گیا۔ نقالی کے ساتھ ساتھ نقالوں نے نام بھی ابن صفی سے ملتے جلتے رکھنے شروع کر دیے جیسے این صفی، ابن سفی، ذہن صفی وغیرہ۔ مرد حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین نقال بھی مقابلے میں آگئیں جن میں نجمہ صفی وغیرہ شامل تھیں۔ یہ نقالی اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب وہ شیزوفرینیا میں مبتلا ہو کر تین برس کچھ نہ لکھ پائے۔ نقالی تک بات رہتی تو ٹھیک تھی مگر ان کی کتابیں بھی بغیر اجازت چھاپی گئیں اور اس میں کوئی ایک پبلشر نہیں بلکہ برصغیر کے بہت سے پبلشرز شامل تھے۔ ان معاملات کا ذکر وہ اپنے قارئین سے اکثر "پیشرس" میں کرتے تھے۔ اس نقالی کا ذکر انھوں نے اپنے ناول "ڈیڑھ متوالے" کے پیشرس میں کیا تھا۔ یہ وہی ناول ہے جو انھوں نے صحت یابی کے فوراً بعد لکھا تھا۔

"آپ کچھ ایسی باتوں کا ذکر کیجیے جو بیماری کے دوران میں میرے لیے مزید اذیتوں کا سبب بنی رہی تھیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں دنیا کا مظلوم ترین مصنف ہوں۔ لاہور کے بعض پبلشروں نے مل کر میری ساری کتابیں چھاپ ڈالیں (میری اجازت کے بغیر) یوں کہ ایک وقتی اپاہج کا ناول تھا اس لیے ایک ہی کتاب کو کئی کئی پبلشرز نے بیک وقت چھاپ کر مارکیٹ میں ڈھیر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بیچ مقداری کتابیں چھپ جانے میں فٹ پاتھوں پر بک گئیں۔ اکثر کتابوں کے نام بدل دیے گئے اور پڑھنے والوں کو دھوکا دیا گیا۔ رہی مختلف قسم کے ناموں اور صفیوں کی بات تو یہ بے چارے سارے قافیے استعمال کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب مجھے کسی "ابن قصی" کا انتظار ہے میری دانست میں تو صرف یہی قافیہ باقی بچا ہے۔ کوئی صاحبہ (اسی قافیہ) والی عرصے سے غلط فہمی پھیلا رہی ہیں کہ وہ میری کچھ لگتی ہیں۔۔۔ لیکن یقین کیجیے کہ میرے والد صاحب بھی ان کے جغرافیہ پر روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔۔۔؟" [81]

اسی طرح ایک اور "پیشرس" میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ویسے بعض خطوط کے جوابات اتنے ہی ضروری ہوتے ہیں کہ ان کا تذکرہ پیش لفظ میں کرنا پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک صاحب نے میرے ناول "خون کا دریا" کے متعلق پوچھا ہے کہ وہ بھی اوریجنل ہے یا نہیں؟ کیوں کہ ویسی ہی ایک کہانی گجراتی میں بھی ان کی نظروں سے گزر رہی ہے۔۔۔

گذارش ہے کہ "خون کا دریا" کی کہانی سو فیصدی میری ہی تخلیق ہے۔
یہ اور بات ہے کہ کسی گجراتی لکھنے والے بھائی نے میری گردن پر چھری پھیر دی ہو۔

اردو میں جو چھریاں پھیری جا رہی ہیں وہ تو آپ کی نظروں کے سامنے ہی ہیں۔۔۔۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ میری کتابوں کا ہندی میں ترجمہ ہوا اور ہندی سے وہ پھر اردو میں منتقل ہوئیں لیکن اس تیسری کاوش میں مصنف کا نام تک بدلا ہوا نظر آیا۔ اس قسم کی ایک کتاب "ریت کی عورت" کے متعلق ایک صاحب نے پوچھا ہے۔ "ریت کی عورت" میرے ناول "بے گناہ مجرم" کا ہندی ترجمہ ہے۔ کسی صاحب نے اردو میں اس کا دوبارہ ترجمہ کر ڈالا۔ میرے ساتھ ایسے لطیفے ہوتے ہی رہتے ہیں اور میں ان سے کافی محظوظ ہوتا ہوں۔ دیکھیے نا، میرے پر اسرار کرداروں ہی کی طرح بعض اوقات یہ کم بخت کتابیں بھی بھیس بدل کر سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں شرلاک ہومز کی طرح کوکین کا انجکشن لے لوں یا عمران کی طرح چیونگم سے شغل فرماؤں؟"[۸۴]

ابن صفی کا ایک اور کردار جس نے مزاح کی ایک نئی جہت پیدا کی وہ ایک تخلیقی کردار "استاد محبوب نرالے عالم" تھے جن سے ملاقاتوں کو انھوں نے امر کر دیا۔ استاد محبوب نرالے عالم مغلیہ خاندان کے آخری چشم و چراغ تھے۔ وہ ساری عمر اپنے جائز حق کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ ایک اخباری کالم "ورنہ شکایت ہوگی" لکھتے رہے۔ ان کی ملاقاتیں ابن صفی سے ہوتی رہتیں۔ وہ بڑی بے وزن شاعری کرتے تھے اور اسے "ساہری" کہا کرتے۔ اسی طرح "ادیب" ان کے ہاں "ادیف" تھا۔ ان کی پوری شخصیت اور تعارف ابن صفی کے دیرینہ دوست شاہد منصور نے اپنے مضمون "یادوں کی برات" میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے:

"ایک دن سہ پہر کو ابنِ صفی کے دفتر پہنچا تو ایک عجیب و غریب شخص کو ان کے پاس براجمان دیکھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور کراچی کی گرمیاں تو آپ جانتے ہیں کتنی پسینا آور ہوتی ہیں مگر وہ صاحب سخت گرم موسم کے باوجود گرم پتلون اور گرم شیروانی میں ملبوس تھے۔ پیروں میں کھسہ اور سر پر سولا ہیٹ تھا۔ پاس ہی ٹین کا بنا ہوا ایک بگل نما بھونپو تھا۔ موصوف کا گھٹا شیو گہرا سانولا چہرہ دیکھنے سے چمک رہا تھا اور وہ کچھ عجیب استغراق کے عالم میں کرسی پر دھرے ہوئے تھے۔ یہ استاد محبوب نرالے عالم تھے۔ اگرچہ ہم اس وقت تک ان کی ذات والا صفات سے واقف نہیں تھے مگر ابنِ صفی ان کو دریافت کر چکے تھے۔ اسی لیے موصوف انھی کے پاس دھرے ہوئے تھے۔ ابنِ صفی کو ایسی نادرِ روزگار شخصیات دریافت کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ استاد محبوب نرالے عالم اپنی قسم کی واحد شخصیت اور بڑے بے دھڑک اور بے پناہ شاعر تھے۔ اردو ادب میں بڑے بڑے اساتذہ گزرے ہیں مگر اتنا لمبا چوڑا تخلص آج تک کسی مائی کے لال کو نصیب نہیں ہوا۔ استاد کا فرمان تھا کہ وہ بڑے شاعر ہیں اسی لیے وہ تھے ورنہ اگر وہ کوئی اور فرمان جاری کر ڈالتے تو ان کا کیا جا سکتا تھا۔ جوش اور جگر سے خود کو بڑا شاعر سمجھتے تھے بلکہ جوش صاحب سے تو خصوصی طور پر شاکی تھے کیوں کہ استاد کا خیال تھا کہ جوش صاحب ان کے ذہن میں گھس کر ان کی تخلیقات کو اڑا لیا کرتے تھے جو ہنوز پردۂ عدم سے استاد کے دماغ کے عرصۂ وجود پر نازل بھی نہیں ہو سکی تھیں۔ حوالے کے لیے وہ جوش صاحب کی نظم گل بدنی کو پیش کیا کرتے تھے جو جوش صاحب نے استاد کے ذہن میں نقب لگا کر سرقہ کر لی تھی۔ اگر جوش صاحب یہ نہ کرتے تو اب تک استاد کی "گل بدنی" مکمل ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہوتی اور جوش صاحب ہی کیا بقول استاد یہ حرکت ان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے غالب بھی ان کے ساتھ کر چکے تھے۔ استاد شاعری میں انفرادیت کے قائل تھے اور اپنی انفرادیت کے ثبوت میں اپنے کلام کی بے وزنی کو پیش کرتے تھے۔ استاد کا کہا ہوا تقریباً ہر شعر بے وزن ہوتا تھا اب اس سے

بڑے کہ استادی اور انفرادیت کا اور کون سا ثبوت ہوا کرتا ہے۔ استاد میں یہ مرض
بھی تھا کہ اکثر ان میں دوسرے بڑے شاعروں کی روح حلول کر جاتی تھی اور
جب بھی ایسا ہوتا تھا تو ان ارواح کے فیض سے استاد کچھ باوزن شعر بھی کہہ لیا
کرتے تھے۔ یعنی باوزن شعر کہنے میں قصور استاد کا نہیں بلکہ استادوں کی
روحوں کا تھا جو زبردستی استاد کے جسم میں حلول کر کے انھیں مجبور کر دیا کرتی تھی۔
اردو کے تمام بڑے اساتذہ کی طرح استاد بھی غم روزگار کا شکار تھے گویا یہ بھی ان
کے استاد اور بڑا شاعر ہونے کی مزید دلیل تھی لیکن انھوں نے غم روزگار پر آہیں
بھرنے شکوے کرنے یا تیرے میرے قصیدے کہہ کر پیٹ پالنے کے بجائے
ایک عوامی دھندا اپنا لیا تھا (یہ واقعی ان کی عظمت کی دلیل تھی مگر وہ خود اسے درخور
اعتنا نہیں سمجھتے تھے) ان کا یہ دھندا "چنا جور گرم" بیچنا تھا جسے وہ "چنا کڑک"
کہتے تھے۔ جب اندھیری راتوں میں بھونپو کو منہ سے لگا کر اپنی پاٹ دار آواز
میں استاد چنا کڑک کی صدا لگاتے تھے تو دور دور سے شائقین کھنچے چلے آتے تھے
۔ استاد "محبوب زمانے عالم" ہی نہیں تھے "محبوب خلائق" بھی تھے ان کی
شاعری کے شائقین کی تعداد چنا خوروں سے بھی زیادہ تھی اس لیے استاد کو اکثر
جو بھی عقیدت مند پا جاتا بری طرح دبوچ لیتا اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ
سننے سنانے کے چکر میں استاد ہفتوں دھندے سے دور رہتے تھے۔ یہ الگ بات
ہے کہ ایسے موقعوں پر اکثر استاد کے قدر دان ان کے کام آتے تھے اور خود ابن
صفی بھی استاد کے ایک بڑے قدر دان تھے۔ بعد میں استاد نے مزید ترقی کر
ڈالی۔ سوڈے بیچے چنے بیچنے چھوڑ دیے۔ لمبی چوڑی سرسید ٹائپ داڑھی
رکھ لی۔ پہلے نجومی بنے پھر عامل کامل اور آخر میں پیر بن گئے مگر وہ الگ قصہ ہے
جو پھر کبھی سنایا جائے گا۔

بہر حال ہم ابن صفی کے دفتر میں داخل ہوئے تو استاد کو وہاں براجمان پایا۔ اس
وقت تک ہم ان سے واقف نہیں تھے بس نام سن رکھا تھا۔ استاد کی وہاں موجودگی
ہمیں کچھ اچھی نہیں لگی کیوں کہ ہم تو ابن صفی کو اپنی تازہ غزل سنانے گئے تھے۔

ہم نے کرسی گھسیٹتے ہوئے ابن صفی سے اشارے سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ ہماری اس حرکت سے استاد کا استغراق ٹوٹ گیا۔ انھوں نے اپنی چمکتی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور کر دیکھا۔ ہم تعارف کے منتظر تھے مگر ہمیں جواب دینے کے بجائے ابن صفی ایک زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ استاد کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔

"کہیے۔ کیا کچھ نزول ہو گیا استاد"

غالبا جو نچلا بہت ہمیں استاد کی موجودگی میں نازل ہو جانے کے بارے میں تھی وہی ہماری موجودگی میں استاد کو بھی لاحق تھی لہٰذا استاد نے پہلے تو ہم دونوں نیازمندوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی پھر کچھ دیر اس طرح منہ اوپر اٹھائے رہے جیسے آسمان میں اڑتی ہوئی قندیل دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر تھوڑی دیر تک ناک بھوں پر زور دیتے رہے جو ان کی خاص ادا تھی پھر جھوم کر بڑی گرج دار آواز میں بولے۔

"سنئے صفی صاحب۔ دیکھیے کیا چیز ہوئی ہے۔

حسن کو آفتاب میں ضم ہو گیا ہے

عاشق کہنہ ور بے خودی کا غم ہو گیا ہے

"جواب نہیں ہے استاد۔ کیا آفتاب میں ضم باندھا ہے کہ بالکل بند ہو کر رہ گیا ہے" ابن صفی نے داد دی "اجی یہ کیا چیز ہے" استاد انکساری سے بولے "پچھلی رات اچانک مجھ میں غالب کی روح حلول کر گئی۔ بڑے بڑے سوال جواب ہوئے میں نے غالب کی روح کو للکار دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ۔

تم بھلا باز آؤ گے غالب

راستے میں پچ جاؤ گے غالب

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو مگر نہیں آتی

"مگر یہ تو وزن دار ہے استاد" ابن صفی نے اعتراض کیا۔

"ارے صاحب میں نے کہا نا کہ غالب کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں کیا کرتا۔"
استاد نے بڑی بے نیازی سے وضاحت کی۔ اب معاملہ میری برداشت سے
باہر ہو چلا تھا۔
مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ابن صفی سے پوچھ ہی لیا۔
"بھئی یہ کون صاحب ہیں۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ"
"ارے یار۔ تم انھیں نہیں جانتے" میرے اشتیاق کو دیکھ کر ابن صفی نے سوکھا
سا منہ بنا کر کہا
"نہیں بھائی۔ میں واقف نہیں ہوں" میں نے کہا
"یہ ہیں امام الجاہلین، قتیل ادب، استاد محبوب نرالے عالم مد ظلہ علیہ" ابن صفی
نے تعارف کرایا اور پھر استاد کی طرف دیکھ کر بولے
"اور استاد یہ ہیں شاہد منصور ہیں۔ شاعری کرتے ہیں"
میں نے اس تعارف پر اور خصوصاً امام الجاہلین کے لقب پر بہت گھبرا کر استاد کی
طرف دیکھا مگر استاد نے ابن صفی کے تعارف پر ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی تھی۔
(بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عبارت تو استاد کے وزیٹنگ کارڈ پر بھی چھپی تھی) استاد
نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے۔
"تو آپ ہیں شاہد منصور۔ ایک دن آپ کو اردو بازار میں کرشن بھائی کی دکان
پر دیکھا تھا۔ ارے صاحب میں گیا اور میرا تعارف کیا میں تو ارتعاش سے گماں کا
دشت لا۔ مکاں میں مقیم مصلوب ہوں۔"
اس عجیب و غریب جملے کو سن کر مارے حیرت کے میرے منہ سے "جی" کے سوا
اور کچھ نہیں نکل سکا۔ اگرچہ میں نہیں سمجھ سکا مگر ابن صفی سمجھ گئے تھے کیوں کہ وہ
استاد کے مزاج شناس ہی نہیں بلکہ ذہن شناس بھی تھے انھوں نے فوراً ہی استاد
کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور ان کا ہدف تلاش کرلیا، جو دو نوجوان لڑکیوں پر مشتمل
تھا، جو سامنے سے آ رہی تھیں۔ ابن صفی کو معلوم تھا کہ استاد پر ایسے مانوس
کذب بے معنی الفاظ بولنے کا دورہ اسی وقت پڑتا ہے جب آس پاس کوئی

"ارے صاحب میں نے کہا نا کہ غالب کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں کیا کرتا۔"
استاد نے بڑی بے نیازی سے وضاحت کی۔ اب معاملہ میری برداشت سے
باہر ہو چلا تھا۔
مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ابن صفی سے پوچھ ہی لیا۔
"بھئی یہ کون صاحب ہیں۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ"
"ارے یار۔ تم انھیں نہیں جانتے" میرے اشتیاق کو دیکھ کر ابن صفی نے سوکھا
سا منہ بنا کر کہا
"نہیں بھائی۔ میں واقف نہیں ہوں" میں نے کہا
"یہ ہیں امام الجاہلین، قتیل ادب، استاد محبوب نرالے عالم مد ظلہ علیہ" ابن صفی
نے تعارف کرایا اور پھر استاد کی طرف دیکھ کر بولے
"اور استاد یہ ہیں شاہد منصور ہیں۔ شاعری کرتے ہیں۔"
میں نے اس تعارف پر اور خصوصاً امام الجاہلین کے لقب پر بہت گھبرا کر استاد کی
طرف دیکھا مگر استاد نے ابن صفی کے تعارف پر ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی تھی۔
(بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عبارت تو استاد کے وزیٹنگ کارڈ پر بھی چھپی تھی) استاد
نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے۔
"تو آپ ہیں شاہد منصور۔ ایک دن آپ کو اردو بازار میں کریمی بھائی کی دکان
پر دیکھا تھا۔ ارے صاحب میں کیا اور میرا تعارف کیا میں تو ارتعاش سے گویں کا
دشت لامکاں میں مقیم مصلوب ہوں۔"
اس عجیب و غریب جملے کو سن کر مارے حیرت کے میرے منہ سے "جی" کے سوا
اور کچھ نہیں نکل سکا۔ اگر چہ میں نہیں سمجھ سکا مگر ابن صفی سمجھ گئے تھے کیوں کہ وہ
استاد کے مزاج شناس ہی نہیں بلکہ ذہن شناس بھی تھے انھوں نے فوراً ہی استاد
کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور ان کا ہدف تلاش کر لیا، جو دو نوجوان لڑکیوں پر مشتمل
تھا، جو سامنے سے آ رہی تھیں۔ ابن صفی کو معلوم تھا کہ استاد پر ایسے نامانوس
کذحب بے معنی الفاظ بولنے کا دورہ اسی وقت پڑتا ہے جب آس پاس کوئی

صنف نازک محوِ خرام ہو۔ اتنے میں وہ دونوں نوجوان خواتین ہاتھوں میں آٹو گراف بک سنبھالے دفتر میں داخل ہوئیں اور ابنِ صفی سے آٹوگراف کی خواستگار ہوئیں۔ جب تک وہ دفتر میں موجود رہیں ایسا لگا کہ استاد کی زبان اور نگاہ دونوں کو پالا مار گیا تھا۔ ان کے جاتے ہی استاد نے ایک جھرجھری لی اور بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ابنِ صفی کی طرف جھک کر بولے۔

”صفی صاحب انسانی تہذیب کی جذباتی اور سکونی مناکحت بہت ضروری ہے۔ غالب، ذوق وغیرہ نے بلکہ مومن نے بھی شعروادبی انجمن ریت کی تفصیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر تحریری ضابطے کی اشتراکیت شعروقی اضطراب کی سند نہیں ہو سکتی۔“

اس جناتی جملے کو سن کر ابنِ صفی جھلا کر بولے

”واللہ استاد! آپ نے تو اپنی نثری گفتگو میں صنعت مستول ابہام پیدا کر دی ہے۔ بھئی بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں“۔ پھر میری طرف مڑ کر بولے“ آپ کو معلوم ہے شاید صاحب کے استاد کا واسطہ کس عظیم خانوادے سے ہے“

صاف ظاہر ہے کہ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے بڑی مسکینی سے انکار میں سر ہلایا تو بولے۔

”بھئی دراصل استاد کا لکھنؤ کے سلطان واجد علی شاہ اختر اور دہلی کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے براہِ راست نسبی تعلق ہے اسی لیے عن قریب استاد قیصر باغ لکھنؤ اور لال قلعہ دہلی کی ملکیت واگزار کرنے کے لیے بھارتی حکومت کو نوٹس دینے والے ہیں۔ نگران کا حقیقی رشتہ مغلوں کے مورثِ اعلیٰ ذوقال خان سے ہے اگرچہ بیچ میں کہیں نادر شاہ درانی اور نوشیروان عادل بھی آجاتے ہیں۔“

بڑی حیرت سے میرے منہ سے نکلا ”ذوقالی“

اور استاد بڑی محجوب مسکراہٹ کے ساتھ بولے

”نہیں صاحب نہیں۔ وہ ذوقالی اور ہوتے ہیں۔ میرے مورثِ اعلیٰ ذوقال خان تھے جو فاتح عالم چنگیز خان کے دادا زاد بھائی تھے اور تھمی کے بجوگی کے نواسے

کے ماموں کے داماد سکندر اعظم تھے۔"

میں سوائے سر ہلانے کے اور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کہا بھی کیا جا سکتا تھا مگر ابن صفی بھانپ گئے کہ میں کس بری طرح چپت پڑنے کے لیے بے قرار ہوں لہٰذا انھوں نے فوراً ہی موضوع بدل دیا اور استاد سے وہ چنا کڑک سنانے کی فرمائش کی جسے سنا کر انھوں نے پی ای سی ایچ سوسائٹی کے مکینوں بلکہ حسینوں کو لوٹ لیا تھا۔ استاد کو کیا عذر ہو سکتا تھا انھوں نے فوراً اپنا بھونپو اٹھایا اور پاٹ دار آواز میں شروع ہو گئے۔

"پی ای سی ایچ کے حسین
میرے چنے سے نمکین
بولے بھائی نجم الدین
پاؤ اک آنے کے تین
چنا کڑک"

سناتے سناتے اچانک استاد رک گئے۔ بھونپو ہاتھ سے رکھ دیا اور شیروانی کے دامن سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مجھ سے بولے۔

"شاہد صاحب یہ تو سیدھی سادی اردو ہے۔ اس میں آپ کو کیا مزہ آیا ہوگا اگر کبھی آپ میری "فارسا" سنیں تو پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ استاد کی شاعری کیا چیز ہے۔"

"فارسا"۔ میری آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ابن صفی ہنس کر کھنکارے "ارے بھئی حیرت کی کیا بات ہے۔ فارسا اور مرہا تو استاد کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ اچھا بھئی مرہا پھر کبھی سہی۔ استاد آپ شاہد صاحب کو فارسا ہی دیں یہ بھی کیا یاد کریں گے۔"

اور استاد تو جیسے منتظر ہی بیٹھے تھے فوراً ہی کان پر ہاتھ رکھ کر شروع ہو گئے مگر شکر ہے اس مرتبہ انھوں نے بھونپو ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔

"نظرتی می نظرتی تی نظرتی می
دھک سکا لرزوں قلفی فروشی جیا بم بم

عطر خوشبو کی طرح عطر فشاں ہو دم بدم
تھی دل، دل دن دل تو تھی تو قلم قلم
نظر تھی تھی نظر تری تری نظر ری ری"

پھر یار لگا ابن صفی میں کچھ اور لوگ آ گئے محفل کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔ پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ابن صفی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ استاد بھی اس درمیان میں ایک دو بار ملے مگر کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی پھر ابن صفی کی مشہور کتاب "ڈاکٹر دعاگو" چھپ کر آ گئی۔ اس کی قسطیں حریت اخبار میں چھپتی رہی تھیں مگر میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ لہٰذا جب کتاب ملی تو بڑے ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیا اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس کتاب میں میں نے استاد محبوب نرالے عالم کو من و عن اسی طرح براجمان پایا جیسے وہ مجھے ابن صفی کے دفتر میں براجمان ملے تھے۔ اپنی تمام تر ہیئت کذائی' شکل و صورت، لباس اور بھوپالی لہجے اور۔ کاموں کے ساتھ کوئی بھی فرق تو نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ قدرت نے استاد کو ابن صفی کا کردار بننے کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔" [۸۳]

جامعہ ملیہ دلی میں شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد جاوید ابن صفی کی تخلیقات میں طنز و مزاح پر یوں بات کرتے ہیں:

"ایک دوسرا کرشمہ جو ابن صفی کے ناولوں میں رونما ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کے یہاں مزاح، بذلہ سنجی اور Wit کے عناصر تقریباً ہر ناول میں پائے جاتے ہیں، مگر حمید کا مزاج عمران کے مزاج سے قطعی مختلف ہے اور ایک دوسری سمت کی نمائندگی کرتا ہے نیز پچیس سال تک متواتر لکھتے رہنے کے باوجود اس سلسلے میں کوئی جھول نہیں پیدا ہو سکا۔" [۸۴]

ابن صفی کے قلم کی قوت کا ایک مظاہرہ صرف چند سطور ہیں مگر ان کی کاٹ ایک دو دھاری تلوار کی مانند ہے:

"اپریل ۱۹۲۸ء کی کوئی تاریخ تھی اور جمعہ کا دن شام کے دھندلکوں میں تحلیل ہو رہا تھا جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی۔ ویسے دوسروں سے سنا

ہے۔اتنا نحیف تھا کہ رونے کے لیے منہ تو کھول سکتا تھا، لیکن آواز نہیں نکال سکتا
تھا۔میرا خیال ہے کہ دوسروں کو میری آواز اب بھی نہیں سنائی دیتی۔کب سے
حلق پھاڑ رہا ہوں.....وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں اور پھر بے تعلقی
سے منہ پھیر لیتے ہیں.....خیر کبھی تو..... کبھی تو......"[۸۵]

ابن صفی کی شعری تخلیقات

ابن صفی نے میٹرک تک آتے آتے شاعری بھی شروع کر دی تھی۔اس ضمن میں انھوں نے "اسرار ناروی" تخلص منتخب کیا۔اس سلسلے میں وہ خود اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"آٹھویں یا نویں درجے میں پہنچ کر شاعری شروع کی۔حضرت جگر مراد آبادی حواس پر چھائے ہوئے تھے لہٰذا غزلیات میں طبع آزمائی ہوئی اور اس زور شور سے ہوئی کہ کبھی کبھی سوچنا پڑتا کہ کہیں سچ مچ تو نہیں پینے لگا۔مثلاً

ہمیں تو ہے مے گل رنگ و گل رخاں سے غرض
بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے
بس اتنا یاد ہے اسرار وقت سے توبہ
کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

یا

یہ تشنگی کے لیے خوشبوئے مے گل رنگ
سہاگ رات میں ہو بوئے بدن جیسے

انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا شاعر ہو چکا تھا۔ایونگ کرسچین کالج الہ آباد کی رنگین فضاؤں میں کہ شہر کا واحد کوایجوکیشن Co Education کالج تھا یہ ذوق پروان چڑھتا رہا۔ہوسٹل میں شعر و سخن کی محفلیں جمتیں۔لیکن فرسٹ ایئر کے سالانہ مشاعرے میں کچھ پڑھنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔سیکنڈ ایئر میں جب بزمِ ادب کی صدارت میرے حصے میں آئی تو کھل کر سامنے آنا پڑا۔اس سال کے مشاعرے میں میری نظم سحری کی آواز اس حد تک پسند کی گئی کہ میرے ایک استاد مسٹر ہگنس Mr Higgins نے جو انگریزی پڑھاتے تھے اور اردو شاعری

سے بھی گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ دوسرے دن کلاس میں کہا "فراق صاحب کی رباعیات اور جنسری کی آواز کے علاوہ مجھے تو اور سب کچھ Eco of Poetry (شاعری کی بازگشت) معلوم ہو رہا تھا۔"[۸۲]

یاد رہے شاعری صرف شاعر کے جذبات کی ترجمانی نہیں، ایک فن ہے جس میں صناعی کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے احساسات و تخیلات، ولولوں، امنگوں اور سب سے اہم یہ اپنے تجربات زندگی کو ایک تخلیقی عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اسے زبان کی موزونیت اور توازن کا اس قدر خیال رکھنا پڑتا ہے جتنا ایک مجسمہ تراشنے والے کو مجسمہ تراشتے ہوئے۔ یقیناً بحر عروض و بحور، استعارات و قوافی اور دیگر لوازمات اہم ضرور ہیں لیکن یہ سب صرف ذرائع ہیں کسی منزل تک پہنچنے کے۔ ہر شاعر کو آوازوں کے جنگل میں اپنی آواز کی ایک شناخت بنانی پڑتی ہے۔ اسے اپنی ایک الگ راہ نکالنی پڑتی ہے یا ہزاروں شاعروں کے استعمال شدہ راستوں پر اپنے قدموں کی ایک علاحدہ چھاپ لگانی پڑتی ہے۔ ہر انسان میں اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ خوبیاں موجود ہیں۔ اسی لیے اس کی شاعری میں بھی ان صلاحیتوں کا جوہر نظر آنا چاہیے۔ اس کی شاعری کو اس کی ذات کا ایک پرتو ہونا چاہیے۔ ابن صفی نے جب شاعری شروع کی تو یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت اور ترقی پسندی کا دور دورہ تھا اور بڑے بڑے اہم نام اس تحریک میں شامل ہونا باعث فخر سمجھتے تھے۔ روایت سے انحراف اس دور کی شاعری کے طریقۂ راسخہ کے خلاف شعوری بغاوت کا نتیجہ تھی۔ غزل کی شدید مخالفت چل رہی تھی۔ صنف نظم عروج پر تھی، غیر مقفّٰی نظم Blank Verse اور دیگر تجربات زوروں پر تھے۔ خود ابن صفی بھی بے پی کمیونسٹوں کے ساتھ کچھ وقت لگا کر تائب ہو چکے تھے۔ مگر اردو شاعری بڑی سخت جان صنف ہے مختلف قسم کی تحاریک نے اسے کمزور نہیں بلکہ مضبوط کیا۔ ان تجربات، اختلافات اور انحراف نے اردو شاعری میں نئے امکانات پیدا کیے اور اس کے دامن کو مزید وسعت دی۔ ابن صفی نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت غزل میں جگر و اصغر کا دور دورہ تھا۔ نوح ناروی تو رشتے کے ماموں تھے اور شاگرد داغ۔ لہٰذا ان کی شاعری پر روایتی رنگ چڑھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں سے بھی فیض یاب ہوئے۔ اس سارے عمل کا اثر ان کی شاعری پر پڑا جس میں دونوں رنگ یعنی روایتی رنگ اور جدید رنگ بھی موجود ہیں۔ عصری حسیت اور رمزی ایمائیت بھی ہے اور عصر سے آگے نکلنے کے امکانات بھی۔ انھوں نے اپنی ذات اپنی شاعری میں چھپا دی۔ گو بعد میں انھوں نے صرف جاسوسی ناول نگاری کی مگر ان کے اندر کا شاعر بھی صرف

ان کی شاعری بلکہ نثر میں اپنی چھب دکھلاتا رہا۔ اگر ابن صفی کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ان کی شاعری میں تازگی اور خوش رنگی کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا عنصر وطن پرستی نظر آئے گا کہ یہ وہ دہائی تھی جب تقسیم ہند تو شیدہ و بیدار بن چکی تھی۔ اس مرحلے پر ابن صفی کا یہ اقتباس بڑی اہمیت کا حامل ہے:

"یہ بات تو بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آئی کہ میں اس وقت بھی ترقی پسند ہی تھا جب آزاد نظم میری طبیعت سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ کیوں کہ بعد کی بحثوں نے ایک مخصوص نصب العین رکھنے والوں کو ترقی پسند قرار دیا تھا اور بقیہ لوگ صرف جدت پسندی تک محدود کر دیے گئے تھے۔"

ابن صفی کی شاعری اور نثر دونوں میں ایک بڑی پُراسرار رعنائیت ہے۔ ان کے جملے بڑے سچے تلے اور مصرعے بڑے چست ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی عمر پختہ ہوتی گئی ویسے ویسے ان کی شاعری اور نثر دونوں نکھرتی چلی گئیں۔ مگر ہم یہاں ان کی شاعری پر بات کریں گے۔ سب سے پہلے ابن صفی کی متذکرہ بالا شاہکار نظم "بنسری کی آواز" [۸۹]

بنسری کی آواز

رات کے پرکیف سناٹے میں بنسی کی صدا
چاندنی کے سیم گوں شانے پہ لہراتی ہوئی
گونجتی بڑھتی لرزتی کوہساروں کے قریب
کھیتی میداں میں پگڈنڈی پہ بل کھاتی ہوئی
آ رہی ہے اس طرح جیسے کسی کی یاد آئے
نیند میں ڈوبی ہوئی پلکوں کو اکساتی ہوئی
آسمانوں میں زمیں کا گیت لہرانے لگا
چھا گیا ہے چاند کے چہرے پہ نکہت کا غبار
بزمِ انجم کی ہر اک تحریر دھندلی ہو گئی
رکھ دیا ناہید نے جھنجھلا کے ہاتھوں سے ستار
ذرہ ذرہ جھوم کر لینے لگا انگڑائیاں
کہکشاں تکنے لگی حیرت سے سوئے جوئے بار

یوں فضاؤں میں رواں ہے یہ صدائے دل نشیں
ذہنِ شاعر میں ہو جیسے اک اچھوتا سا خیال
یا سحر کے سیم گوں رخسار پہ پہلی کرن
سرخ ہونٹوں سے بچھائے جس طرح بوسوں کے جال
گاہ تھمتی، گاہ خلا کا سینہ چیرتی
یوں فضا میں اٹھ کے، ہو جاتی ہے مدغم ہائے ہائے
شام کی دھندلاہٹوں میں دور کوئی کارواں
کوہساروں سے اتر کر جیسے میدانوں میں آئے
بنسری کی تان ہاتھوں میں لیے گیتوں کے ہار
مائلِ پرواز ہے نغموں کے پر تولے ہوئے
جائے گی شاہدِ صبا کے دوش پہ سوئے افق
صبح کی پہلی کرن کے خیر مقدم کے لیے
اے ہوا کے نرم جھونکو لے نہ جاؤ یہ صدا
یوں نہ لوٹو میرے احساسات کا رنگیں سہاگ
بانکے لمحو! ٹھہر جاؤ سحر ہونے نہ پائے
ورنہ ہنگاموں میں گم ہو جائے گا بنسی کا راگ
آتشِ نفس سے جلنے دو مری شمعِ خیال
سینۂ مشرق میں تم للہ بھڑکاؤ نہ آگ

یہ نظم ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی۔ ابن صفی کی زیادہ تر نظمیں عصری معاملات اور مسائل سے سنجیدگی اور فلسفیانہ انداز میں رشتہ استوار کرتی ہیں۔ آزادی کا مسئلہ ہو یا وطن پرستی، داخلی و خارجی سطح کی کشمکش ہو یا حقیقت و شباب کی جدوجہد اپنے احساسات کی پامال شدہ دنیا ہو، وہ بے ساختہ اور سلیس انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اپنی نظم "بنسری کی آواز" کے ساتھ ساتھ جہاں شاعر کا تخیل مائل بہ پرواز ہے وہاں وہ آخری مصرع میں زمینی حقائق کا بھی ادراک سمو لیتے ہیں۔ اس نظم میں غنائیت اور آہنگ اس پائے کا ہے جو اسے شاعری میں ایک اعلیٰ درجہ دلاتی ہے۔ اس نظم کا مجموعی جائزہ مسز جنکس کی اس بات کی پوری تائید کرتا ہے کہ اس

مشاعرے میں یقیناً اس نظم کے علاوہ بقیہ شاعری صرف ایک گونج کی طرح سنائی دی ہوگی۔

نظموں کے ساتھ ساتھ ابن صفی کی غزل روایت کی حدود میں رہ کر بھی غیر روایتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل کے مروجہ لوازمات تو وہی رہیں گے مگر نئے مضامین نکالنا تو ہر شاعر کی اپنی طبیعت اور اہلیت پر منحصر ہے کہ وہ بھی پرانے مضامین پر طبع آزمائی کرے یا اپنے لیے نئی راہیں نکالے۔ ابن صفی نے بلاشبہ اپنی غزل میں نئے مضامین بیان کیے اور انھیں اپنے زورِ بیاں اور صناعی سے امر کر دیا۔ ان کی یہ غزل[۸۸] سادگی میں پرکاری کا کیا عمدہ نمونہ ہے:

اے نگارانِ خوب رو آؤ
ہو کے دیکھو تو دو بدو آؤ
یوں نہ دیکھو کہ راہ رو ہو گا
تھی تمھاری ہی جستجو آؤ
اے غزالانِ خوش خرام رکو
اک ذرا دیر گفتگو آؤ
کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے
پھر چھلکنے لگے سبو آؤ
رات ڈھلنے پہ آئے بھی تو کیا
گرم ہے وقت کا لہو آؤ

اپنے مطلعے سے یہ غزل پڑھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا کہ نصف صدی قبل لکھی گئی ہوگی۔ مضامین اور ندرتِ خیال اسے ایک منفرد غزل بنانے پر صاد ہیں۔ اسی نوع کے تجربات انھوں نے اپنی اس غزل[۸۹] میں بھی کیے ہیں جو اسی دور میں لکھی گئی تھی۔ یہ غزل ایک نیا رنگ اور آہنگ لیے ہوئے ہے۔

وہ جس کا سایہ گھنا گھنا ہے
بہت کڑی دھوپ جھیلتا ہے
ابھی تو میرے ہی لب ہلے تھے
مگر یہ کس شخص کی صدا ہے
اگر میں چپ ہوں تو سوچتا ہوں
کوئی تو پوچھے کہ بات کیا ہے

مرے لبوں پہ یہ مسکراہٹ
مگر جو سینے میں درد سا ہے
کوئی شکایت نہیں کسی سے
کہ شوق اپنا بھی نارسا ہے
اسی جگہ کیوں بھٹک رہا ہوں
اگر یہی گھر کا راستہ ہے
ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے
ابھی تو جینے کا حوصلہ ہے

تغزل، شعریت اور صوتی آہنگ سے بھرپور یہ شاعری دراصل روایت، حال کا ادراک اور آنے والے دور کے تمام امکانات کے بیچ بین ایک ہم آہنگی کا نام ہے۔ ابن صفی کی شاعری میں واردات قلبی، داستان سرائی، لطیف جذبات و احساسات، امید و یاس کی کشاکش، صبر و ضبط کا عکس، حالات کی ستم گساری، راہ شوق کی جلوہ آرائیاں، ایک منفرد تیور، غم والم کا اک نئی طرز سے اظہار، درد و حسن آشنائی، کلاسیکی رچاؤ اور ندرت خیال سب اس طرح گھل مل کے نظر آتے ہیں کہ ان کی شاعری سے یہ رنگ علاحدہ کرنا ممکن نہیں۔ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کا سفر دراصل تہذیب انسانی ہی کے تسلسل کا دوسرا نام ہے اور ابن صفی کی شاعری اسی تسلسل کو لے کر آگے بڑھتی ہے:

راہِ طلب میں کون کسی کا، اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے، رشکِ غزالاں، سب جانے پہچانے ہیں
تنہائی سی تنہائی ہے، کیسے کہیں، کیسے سمجھائیں
چشم و لب و رخسار کی تہ میں روحوں کے ویرانے ہیں
اُف یہ تلاشِ حسن و حقیقت، کس جا ٹھہریں، جائیں کہاں
صحنِ چمن میں پھول کھلے ہیں، صحرا میں دیوانے ہیں
ہم کو سہارے کیا راس آئیں، اپنا سہارا ہیں ہم آپ
خود ہی صحرا، خود ہی دوانے، شمع نفس پروانے ہیں
اپنے وجود کی مستی سے ہم رندوں کے احوال نہ پوچھ
قدم قدم پہ بکھیر گرد سے نفس نفس مے خانے ہیں

بالآخر تھک ہار کے یارو! ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا، باقی سب افسانے ہیں

ابن صفی کی یہ غزل [۹۰] شاعری ذات کا سچا اور کھرا اعلامیہ بن کر ابھرتی ہے۔ اس میں عصری حسیت، گم گشتہ تہذیب و ثقافت کی بازآفرینی اور حال و مستقبل سے رابطہ و تمام لوازمات ہیں جو انھیں اپنے معاصر بلکہ اپنے عصر سے آگے کا شاعر قرار دینے میں حق بجانب نظر آتے ہیں۔ اکثر فرمائش پر ابن صفی یہی غزل سنایا کرتے تھے۔ ان کی تحریر کردہ فلم میں بھی یہ غزل گائی گئی۔ تاہم ان کے کلام میں اکثر غزلیں اس پائے کی ہیں جن کو ہم کسی بھی طور نظرانداز نہیں کر سکتے۔

ابن صفی کی ایک طویل نظم "طلسم ہوشربا" [۹۱] ایک بڑی اہم اور منفرد نظم ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک کے حالات کو منظوم انداز میں پیش کیا ہے کہ کس طرح افراسیاب جو شر کے نمائندے کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے مختلف افراد اور نظام ہائے حکومت اور سرمایہ داری کی شکل میں آکر بنی نوع انسان کا استحصال کرتا رہا۔ نظم کل پانچ حصوں پر مشتمل ہے جس میں پہلا حصہ غزل کی صورت نو اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں وہ افراسیاب کی شکست کو ایک خواب قرار دیتے ہیں اور اس کی مختلف صورتوں میں دنیا میں آمد کا ذکر ملتا ہے کہ کبھی وہ فرعون و شداد تو کبھی قارون اور نمرود کا روپ اختیار کرتا رہا اور بنی نوع انسان کے لیے باعث زحمت بنتا رہا۔ تیسرے حصے میں مختلف انبیا کی آمد اور افراسیاب کی روپوشی کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس حصے میں ابن صفی نے شہنشاہیت اور جمہوریت کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ اگلے حصے میں وہ افراسیاب اور سرمایہ داروں کا گٹھ جوڑ بتاتے ہیں۔ زمیں پر کس طرح سارے نظام مل کر عام آدمی کا استحصال کرتے ہیں، سب کا پردہ افراسیاب کی صورت چاک کرتے ہیں۔ نظم پڑھ کر یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ افراسیاب کہیں ہماری طرح کا انسان تو نہیں جو آج کی مفاد پرست زندگی میں کوئی بھی روپ اپنا لے کوئی بھی نظام اپنا لے۔

ابن صفی نے جب جاسوسی دنیا اور بعد ازاں عمران سیریز لکھنی شروع کی تو وہ اپنی شاعری کو وہ وقت نہ دے سکے جس کی وہ حق دار تھی۔ اس بات پر ان کے قریبی رفقا اور اساتذہ نالاں بھی رہے۔ مولانا انوار الحق جو ایونگ کرسچین کالج میں ابن صفی کے استاد تھے اس ضمن میں اپنے مضمون "میں کسی ابن صفی سے واقف نہیں" میں لکھتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسرار احمد اپنے ہم جماعتوں میں بڑی ہر دل عزیز

شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت خاموش طبیعت اور ہر معاملے پر گہری نظر رکھنے
کے عادی۔ کالج کے مجلے میں ان کی نگارشات ایک خاص مقام رکھتی تھیں۔
اسرار احمد کالج کے مجلے کے مدیر بھی تھے۔ بات شاعری کی آنکلی ہے تو آپ کو یہ
بھی بتا دوں کہ اسرار احمد بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ نازک احساسات اور
بلند خیالات کے مالک۔ طالب علمی کے زمانے میں شاعری ان کا وصف خاص
تھی۔ کالج کے پرنسپل [illegible] مالویا Dr. B.B. Malvia کٹر قسم کے
کرسچین ہونے کے باوجود اردو ادب اور شعر و شاعری میں اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔
اسرار کی شاعری انہیں بے حد پسند تھی۔ خاص طور پر موصوف کا ایک شعر "رنگ نہ
جانے پائے بہت دیکھا" بی۔ بی۔ مالویا کو اس قدر پسند آیا کہ وہ اکثر اس کی
تعریف کرتے۔ مجھ سے کہا کرتے "اسرار کی شاعری میں ایک جذبہ ہے، زندگی
کی تحریک ہے۔ کسی دن اس کا شمار چوٹی کے شاعروں میں ہوگا۔ بی۔ بی۔ مالویا
اگر آج زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری طرح یہ دیکھ کر یقینی طور پر دکھ ہوتا کہ اسرار
جیسے ایک انقلابی شاعر ہونا چاہیے تھا جاسوسی ناول نگار کیسے بن گیا؟" [۹۲]

ان کے قریبی دوست مصطفیٰ زیدی ان کو اکثر کہا کرتے تھے

"اسرار ساری کو زہر نے دیا...... تمھاری نظم "بشر کی آواز" اکثر سنانے
میں گونج محسوس ہوتی ہے۔" [۹۳]

ابن صفی کی نظمیں ہوں یا غزلیں، ان کے اسلوب کے جداگانہ انداز نے مشاہدے کی ندرت اور
موضوعات کے تنوع کے ساتھ مل کر ان کے اشعار میں ایسی فضا پیدا کی ہے جو پرانی ہونے کے باوجود نئی
نئی سی لگتی ہے جو اپنے اندر ایک دل کشی رکھتی ہے جو ابن صفی کی شاعری کو مختلف بناتی ہے اور اس کی
انفرادیت کی مظہر ہے۔

ابن صفی بطور فلم نویس

ابن صفی نے ایک فلم بھی تحریر کی۔ "دھماکا" [۹۴] اس فلم کے فلم ساز محمد حسین تالپور (المعروف
مولا بخش) تھے اور ہدایات قمر زیدی کی تھیں۔ فلم کی موسیقی لال محمد اقبال نے دی جب کہ گیت ابن صفی اور
سرور بارہ بنکوی نے لکھے۔ فلم کی کہانی ان کے ناول "بے باکوں کی تلاش" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی جس کا

مقصد غیر ملکی قوتوں کے ان ہتھکنڈوں کو آشکار کرنا ہے جن کی رو سے وہ مقامی لوگوں کو بلیک میل کر کے قومی راز چرانا چاہتے ہیں۔ یہ فلم ۱۴ دسمبر ۱۹۷۴ء کو سینما گھروں کی زینت بنی۔ اس فلم میں اپنے ناولوں کے مرکزی کرداروں کے برعکس ظفر الملک اور جیمسن سامنے آئے۔ ظفر الملک کا کردار آج کے معروف اداکار جاوید شیخ نے کیا جو اس وقت جاوید اقبال کہلاتے تھے۔ فلم کی ہیروئین شبنم تھیں۔ جیمسن کا کردار فلم ساز مولانا ہپی نے ادا کیا۔ اس فلم میں بھی ابن صفی نے اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کیا جس کی مختصر تفصیل کچھ یوں ہے:

☆ دیگر فلموں کے برعکس اس فلم کی سب سے مقبول غزل فلم کے ولن نے گائی۔

☆ میر کی غزل مغربی انداز سے گائی گئی اور شیکسپیئر کی شاعری قوالی کے انداز سے گایا گیا۔ یہ بات اب تو اتنی معیوب نہیں لگتی بلکہ اس طرح کے تجربات موسیقی میں کیے جا رہے ہیں تاہم ستر کی دہائی میں اس قسم کے تجربات زیادہ مقبول نہیں تھے۔

☆ ابن صفی نے اس فلم کے مکالموں اور گیتوں کے ساتھ ساتھ ہیروئن کے کپڑے بھی ڈیزائن کیے۔

☆ فلم میں مکشوی آواز کے لیے آڈیشن ہوئے مگر سب سے مناسب آواز خود ابن صفی کی تھی اور انھی کی آواز فلم میں شامل کی گئی۔

خاکہ نگاری

خاکہ ایک غیر افسانوی نثری صنف ہے جسے مرقع یا قلمی تصویر بھی کہا جا سکتا ہے۔ خاکہ نگاری ایک منفرد، مقبول اور ترقی یافتہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش اردو کے قدیم تذکروں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" میں خاکہ نگاری کے بعض عمدہ نمونے موجود ہیں۔ مگر اس صنف کا باضابطہ آغاز بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں سے ہوا۔ کسی بھی خاکے میں کسی شخصیت کے ظاہری اور باطنی اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ خاکے میں اس شخصیت کی خوبیوں یا خامیوں کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس شخصیت کی ایک قلمی تصویر ابھر آئے۔ ابن صفی نے جہاں اردو ادب کے گلشن میں نثری کہانیاں، شاعری اور طنز و مزاح کے خوب صورت اور قسم قسم کے پھول کھلائے، وہیں انھوں نے خاکوں کی صورت میں اپنے دوستوں کو امر کر دیا۔ ان کے لکھے دو خاکے فی الوقت دستیاب ہیں۔ ان میں ایک خاکہ مصطفیٰ زیدی اور دوسرا ابن سعید (پروفیسر مجاور حسین رضوی) کا ہے۔ خاکہ لکھنا دراصل ایک نقش

کھینچتا ہے کسی بھی شخص کی پوری شخصیت کا، اُس کی عادات کا، اُس کے اطوار کا، اس کی خوبیوں کا اور خامیوں کا۔ یعنی یہ ایسا ہو کہ اُس شخص کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ تحریر ایسی ہو کہ جب خاکہ مکمل ہو تو اس شخصیت کی پوری شناسائی حاصل ہو جائے۔ ابن صفی کی تحاریر بھی اس معراج تک پہنچتی ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے مصطفیٰ زیدی اور ابن سعید کی پوری شخصیت قاری کے سامنے لے آتے ہیں۔ مصطفیٰ زیدی کے خاکے "میرے بچپن کا ساتھی" میں وہ ایک کالج کے طالب علم کا کچھ ایسا نقشہ کھینچتے ہیں:

> "۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں ایونگ کرسچین کالج الٰہ آباد میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ غالباً دسمبر کے اواخر کی ایک خوشگوار شام تھی اور ہم سب سالانہ مشاعرے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں اپنا ذریعہ عزت شاعری ہی تھی اور کالج کے بڑے شعرا میں شمار ہونے کی بنا پر بزم ادب کی صدارت بھی میرے ہی حصے میں آئی تھی۔ لہٰذا مشاعرے کے انتظامات میں میرا دخل ہونا ضروری ٹھہرا۔ مشاعرہ غیر طرحی تھا۔ صدر شعبہ اردو مولانا انوار الحق صاحب کی تجویز تھی کہ طالب علم شعرا جو غزل یا نظم پڑھنا چاہیں وہ پہلے انھیں دکھائی جائے۔ موصوف نہیں چاہتے تھے کہ کالج کا کوئی طالب علم غیر معیاری کلام پیش کرے۔ ان غزلوں اور نظموں کو دیکھنے کے لیے مولانا نے جن طلبا کا انتخاب کیا ان میں میرا نام بھی تھا۔ بہرحال مولانا کی نگرانی میں یہ کام شروع ہوا تھا کہ ایک صاحب بولے: "فرسٹ ایئر کے ایک طالب علم نے اس طریق کار پر شدت سے احتجاج کیا ہے اور اس نے اپنی نظم نہیں دی۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ کوئی مصطفیٰ حسنین ہیں اور تیغ تخلص کرتے ہیں۔ مولانا بولے۔" یہ نام ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں بلاؤ"۔
>
> تھوڑی دیر بعد جو صاحب زادے تشریف لائے انھیں دیکھ کر مولانا بولے۔
>
> "ارے آپ شاعر بھی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا"۔
>
> وہ بڑے شرمیلے انداز میں مسکرائے اور سر جھکا لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انھیں "تیغ" کی کیسے سوجھی، یہ تو "توتی" کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔

"لائیے نکالیے اپنی نظم" مولانا نے انھیں گھورتے ہوئے کہا۔ انھوں نے جیب سے تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر مولانا کے حوالے کر دیا اور بت بنے کھڑے رہے۔

کچھ عجیب سی ہیئت تھی۔ شیروانی کا ایک بٹن غائب تھا، چوڑی موری کے پاجامے کا ایک پائنچہ دوسرے سے کسی قدر اونچا نظر آ رہا تھا، بال الجھے ہوئے۔۔۔ مونچھیں اپنے طور پر بڑھ کر شاید داڑھی کی منتظر تھیں۔ بہر حال چہرہ ابھی ریزر سے روشناس نہیں ہوا تھا۔

مولانا نے نظم دیکھی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں نے نظم دیکھی اور سوکھا سا منہ بنا کر کہا: "جوش کی نقالی ہے"۔ اور پھر مجھے اس منحنی سے لڑکے کی آواز نے چونکا دیا۔۔ عجیب سی گونج اور گرج تھی اس کی آواز میں۔

کہنے لگا: "میں جانتا ہوں آپ نوح ناروی کے بھانجے ہیں، آپ سے باہر بات کروں گا"

میں نے کہا: "میاں! کیا مار دو گے"۔

"جی نہیں آپ کو بتاؤں گا کہ جوش کی نقالی مجھے ایک دن کیا بنانے والی ہے"۔

مولانا نے بات آگے نہ بڑھنے دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس کے بعد ہم باہر بھی ملے لیکن تیغ نے اس گفتگو کا حوالہ بھی نہ دیا۔ پھر ہم بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔" [۹۵]

خاکے میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ ابن صفی اور مصطفیٰ زیدی کی ملاقاتیں قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہیں اور مصطفیٰ زیدی ابن صفی سے اس بات پر نالاں تھے کہ انھوں نے شاعری پر مکمل توجہ دینے کی بجائے پہلے مزاح نگاری اور پھر جاسوسی ناول لکھنے شروع کر دیے۔ اس کے علاوہ بھی دو دوستوں کی نوک جھونک جاذب توجہ ہے۔ اس خاکے میں ہجرت کے بعد مصطفیٰ زیدی اور ابن صفی کی ملاقات قابل ذکر ہے کہ ابن صفی تو لالو کھیت میں ایک گھر میں رہائش پذیر تھے جب کہ زیدی صاحب ابھی جیکب لائن میں ایک خیمے میں قیام پذیر تھے۔ یہ خاکہ محض ایک خاکہ نہیں بلکہ اس میں ایک دوست کی شخصی و فنی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس کا اختتام بڑا خوب صورت ہے۔ ابن صفی لکھتے ہیں:

"اب جب کہ مصطفیٰ زیدی ہم میں موجود نہیں ہے، مجھے اس کا یہ شعر بڑی شدت سے یاد آرہا ہے:

دو دن کی یہ محفل ساقی رندوں سے ہنس بول کے کاٹ
ہم بھی راہ لگیں گے اپنی تیرا ہمارا ناتا کیا

اسے زندگی سے پیار تھا، وہ زندگی کو امر سمجھتا تھا۔ وہ نہیں رہا تو زندگی کا ایک معتبر ہی تو کم ہوا ہے۔ لیکن اپنے نظریۂ حیات کے مطابق وہ آج بھی زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک کرۂ ارض پر زندگی موجود ہے۔" [۹۶]

ابن سعید کے خاکے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ خاکہ ابن صفی نے نہیں بلکہ طنز و مزاح نگار نے لکھا ہے۔ شگفتگی اور مزاح سے بھرا یہ خاکہ ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دیتا ہے اور اس کو پڑھ کر ابن سعید کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ یہ ابن صفی کے فن کا اعجاز ہے کہ ان کے لکھے خاکوں میں آپ ان کے ممدوح کو چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ ابن صفی کے قلم کی سب بڑی خاصیت اختصار ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ ان کا مقصد بیان مکمل کرداری کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ ابن سعید کے خاکے کی یہ سطور میری بات کی تائید کریں گی:

"ہوسکتا ہے کہ اب وہ "فرشتہ" بن گیا ہو۔ ورنہ سات سال پہلے تو ہم دونوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ آدمی کو آدمی ہونا چاہیے۔ فرشتہ بننے کی کوشش اسے عموماً تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ ہاں تو سات سال پہلے وہ آدمی ہی تھا۔ یعنی خیر و شر کا مجموعہ۔ محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی۔ صلح جو بھی تھا اور جھگڑالو بھی۔ حتیٰ الامکان شریف بھی اور کمینہ بھی۔ خدا کرے وہ اب بھی آدمی ہی ہو۔" [۹۷]

☆☆☆☆

مطبوعہ تصانیف کا جائزہ

ابن صفی کی جاسوسی دنیا

جاسوسی دنیا کی ابتدا "دلیر مجرم" سے ہوئی اور "صحرائی دیوانہ" پر اس کا اختتام ہوا۔ ان دو ناولوں کے درمیان ۱۲۵ ناول آتے ہیں۔ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں کچھ ایسے تصورات پیش کیے جو آج کی صورت حال پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر انھوں نے ملکی یا صوبائی سطح پر ہونے والے جرائم کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح کی سازشوں پر بھی قلم اٹھایا۔ ایسے سائنسی نظریات پیش کیے جو اس وقت دیوانے کا خواب نظر آرہے تھے مگر کچھ ہی عرصے میں یہ تمام خواب حقیقت کا روپ دھار گئے۔ جاسوسی دنیا کے اہم ترین ناولوں کا مختصر جائزہ:

دلیر مجرم

دلیر مجرم مارچ ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس ناول میں جہاں فریدی اور حمید متعارف ہوئے وہیں ابن صفی نے مذاہب اور تہذیب کی جنگ سے بالاتر ہو کر ایک نظریہ پیش کیا ہے "انسانیت" جو ہر چیز سے برتر ہے۔ کتاب کے آغاز میں سیتا دیوی نامی ایک ہندو خاتون کا کردار دکھایا گیا ہے جنھوں نے ایک مسلمان بچے ڈاکٹر شوکت علی کی پرورش کی۔ اس خاتون نے نہ صرف شوکت علی کی دنیوی تعلیم کا بندوبست کیا بلکہ اسے دینی تعلیم بھی دلوائی۔ یہ کردار جہاں ابن صفی کی روشن خیالی اور رواداری کا عکاس ہے وہیں ایک پیغام ہے کہ انسانیت کا کوئی مذہب نہیں۔ ایک انسان دوسرے انسانوں کی خدمت مذہب اور ذات پات دیکھے بغیر بھی کر سکتا ہے۔

فریدی اور لیونارڈ

یہ ناول پہلی بار ماہنامہ "نکہت" میں جون ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پہلی بار ایک غیر ملکی مجرم لیونارڈ خفیہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کے روپ میں فریدی کے ملک میں

داخل ہوتا ہے۔ اس ناول میں ابن صفی نے فنزلا کا کردار متعارف کروایا۔ فریدی یورپ کے مشہور بلیک میلر کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تاہم فنزلا رزنتل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی کہانی جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہونے والے ناول "فنزلا رز کی واپسی" میں ختم ہوتی ہے جب فریدی اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پراسرار کنواں

جولائی ۱۹۵۲ء میں شائع ہونے والا یہ ناول اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں فریدی کے والد کے دوست طارق کا تعارف کروایا گیا ہے۔ نسلاً عرب ہے مگر دنیا کی بہت سی زبانیں اہل زبان کی طرح بول سکتا ہے۔ اس کا پالتو نیولا بھی بہت سی صفات کا مالک ہے جو برازیل کے جنگلوں میں پائی جانے والی ایک خاص نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نیولا "شوٹا کی" کہلاتا ہے۔ بڑے بڑے شاطر منگوں میں کالے اور کسی چیز کو سونگھنے کے بعد تلاش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ کہانی انسان کی فطرت میں چھپی دولت کی ہوس اور اس کی طلب میں سگے رشتوں کی پامالی کی داستان ہے جس کا انجام بڑا غیر متوقع ہے۔

خطرناک بوڑھا اور مصنوعی ناک

یہ ناول اگست اور ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی ایک ایسی سازش کا پردہ چاک ہوتا ہے جو ایک بڑی گہری منصوبہ بندی کر کے رچائی جاتی ہے۔ کہانی ایسے مجرم کے متعلق ہے جو برطانیہ سے فلسفے اور جرمنی سے سائنس کی اعلیٰ ڈگری کا حامل ہے مگر انتقام کے رستے میں آ کر وہ بیماری سے تنگ آ کر جرائم کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ انتقامی جذبہ، لالچ اور سونا بنانے کا جنون ایک انسان کو کس حد تک گرا سکتا ہے یہ سب اس کہانی میں نظر آئے گا۔ انتہائی حد تک دلیر اور ذہین مجرم کہانی میں بہت سے پینترے اور روپ بدلتا ہے۔ مگر آخر کار مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو قانون سے نہیں بچ سکتا۔

موت کی آندھی

جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہونے والا یہ ناول جاسوسی ادب میں ایک کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ انسانی سوچ کی تباہ کاریاں، توہمات اور جنون اس پوری کہانی کا مرکز ہے۔ ایک رقاصہ کے قتل سے شروع ہونے والی کہانی ایسے انجام تک جاتی ہے کہ قاری کی سوچ کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اس ناول کو ابن صفی کا وہ پہلا ناول بھی کہا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے محیر العقول سائنسی ایجادات کے بارے میں بیان کیا

ہے۔ فریدی اور حمید اس بار مصر کے ایک ساحلی علاقے کا سفر کرتے ہیں جہاں فریدی [illegible]
اور دلیری سے جرمن سائنس دانوں کے ٹھکانے کا کھوج لگاتا ہے۔ اس ٹھکانے میں جو ایک چٹان کے
اندر واقع تھا باقاعدہ بجلی گھر قائم تھا جس کی مدد سے ریڈیائی لہروں کی قوت سے لوہے کے دیو قامت
روبوٹ (اگرچہ ابن صفی نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا) چٹان سے باہر نکل کر انسانوں کی ٹانگیں چیر دیا
کرتے تھے۔ یہاں ایک ٹیلی وژن نما مشین تھی جس سے مصنوعی آندھیاں پیدا کی جاسکتی تھیں اور
پورے ساحل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایسی مشینوں کے کئی مختلف پینلز
Panels ہوتے ہیں جن پر بٹنوں کی لمبی قطاریں ہوتی ہیں۔ مگر ابن صفی نے اس مشین کا جو نقشہ کھینچا ہے
وہ صرف ایک سکرین پر مشتمل ہے جس سے دھیان Touch Panel کی طرف جاتا ہے جس کا
استعمال اس ناول کی اشاعت کے کئی دہائیوں کے بعد شروع ہوا۔ اس داستان میں ابن صفی نے نازیت
کی مخصوص ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے۔ کہانی اتنی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے کہ ناول ختم کیے بنا چین نہیں
آتا اور جتنی بار بھی پڑھیں ہر بار ایک نیا لطف آتا ہے۔

ہیرے کی کان

انور اور رشیدہ سیریز کا پہلا ناول ہے جس کی تخلیق ابن صفی نے فروری ۱۹۵۳ء میں کی۔ یہ ناول
ابتدا سے لے کر انتہا تک انور اور رشیدہ کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانی انسانی سرشت کے بھیانک
پہلوؤں طمع دولت اور ہوس کا احاطہ کرتی ہے۔

نیلی روشنی

اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہونے والے ناول میں جنوبی امریکا سے تعلق رکھنے والی ایک مورتی کا
ذکر ہے اور ساتھ ہی ساتھ بدنام زمانہ ڈاکو "سنگ ہی" کا بھی تعارف کروایا گیا ہے۔ چینی نژاد سنگ ہی
دنیا کی کئی زبانوں پر قادر ہے اور اپنی مرضی سے کسی بھی ملک میں دندناتا پھرتا ہے۔ وہ برستی گولیوں سے
بچنے کا فن جانتا ہے جسے اس نے "سنگ آرٹ" کا نام دیا ہے۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی ہے اور جنسی
بے راہ روی اس کی پہچان ہے۔ بقول ابن صفی ساری دنیا گویا سنگ ہی کی خالہ جی کا گھر ہے۔ وہ دنیا کی
حکومتوں کو انتہائی مطلوب ہے۔ کہانی ایک نایاب چاندی کے زیور کے گرد گھومتی ہے جس پر ایک تحریر
موجود ہے جو ممکنہ طور پر جنوبی امریکہ میں موجود انکا نسل کے خزانے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ کہانی
"خونی بگولے" میں جا کر ختم ہوتی ہے۔

لاشوں کا آبشار

۱۹۵۳ء کے پچھلے مہینے میں منظر عام پر آنے والا ناول "لاشوں کا آبشار" ایک بہت ہی منفرد ناول ہے۔ یہ ناول انسانی ذہن کی فتنہ سازیوں اور انتقام کی ایک ایسی داستان ہے جو بھلائے نہیں بھولتی۔ اس ناول میں لاسلکی ہتھیاروں Wireless Weapons کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ہزاروں کے مجمعے میں ایک سیاسی رہنما کو لاسلکی رائفل سے نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ کہانی کا پلاٹ بھی بے حد پیچیدہ اور گنجلک ہے اور ڈاکٹر کیو پر بالکل آخر میں آ کر روشنی پڑتی ہے۔ فریدی بڑی خون ریزی کے بعد مجرم پر قابو پاتا ہے۔ اس کہانی میں ابن صفی نے معاشرے کے ایک ایسے ناسور کا احاطہ کیا ہے جس کا تذکرہ کرنا معیوب Taboo سمجھا جاتا ہے۔ مجرم دراصل ایک ناجائز اولاد تھی جس کا طعنہ اسے زندگی بھر دیا جاتا رہا۔ اسے اتنا ستایا گیا کہ اس کی شخصیت میں انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا۔ اگر اسے اس نفرت کا نشانہ نہ بنایا جاتا تو شاید وہ معاشرے کا ایک کارآمد فرد ہوتا۔ ابن صفی کا ایک اور ناول ذاتی انتقام کی تباہ کاریوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ناول "سینکڑوں ہم شکل" ہے جس میں ایک بدصورت ڈاکٹر کو اس کی بدصورتی کی بنا پر طعن و تشنیع کی جاتی ہے تو وہ بھی معاشرے سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ یہ ناول نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح ابن صفی نے ایک اور ناول میں Incest یعنی زنا بالمحرمات کو موضوع بنایا تھا۔ یہ ناول "زہریلا آدمی" کے عنوان سے فروری ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس طرح کے ناول لکھنے کا مقصد اپنے قارئین کی ذہنی اور فکری تربیت کرنا تھی کہ وہ ذہنی بلوغت کا ثبوت دیں اور اس مقصد کے لیے وہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا کرتے تھے۔

برف کے بھوت

اکتوبر ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آنے والی کہانی "برف کے بھوت" ذہن سے چپک کر رہ جانے والی ایک ایسی داستان ہے جس میں محیر العقول واقعات قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں۔ کہانی نیکم گڑھ کے مختلف حصوں میں ڈیڑھ فٹ لمبے پیروں کے نشانات سے شروع ہوتی ہے۔ پھر وہاں سفید لباس میں دیو قامت بھوت نظر آتے ہیں جن پر گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں۔ یہ کہانی ایک سائنس دان کے گرد گھومتی ہے جو جنگی جنون میں مبتلا ہو کر قیامت خیز اور مہلک کیمیاوی گیس بنانے میں مصروف تھا۔ یاد رہے کہ یہ ۱۹۵۳ء ہے جب کیمیاوی ہتھیاروں کا ذکر ایک بالکل نیا نظریہ تھا۔ اس کہانی میں بھی انسانی ذہن کی تباہ کاریوں کو واضح کیا گیا ہے کہ ایک انسان جب جانور بن جائے تو وہ کس حد تک گر سکتا ہے۔

جنگل کی آگ

فریدی اور حمید کے علاوہ ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے ناول میں سب اہم کرداروں میں دیو اللہ شاستری شامل ہے۔ وہ مشرقی علوم کا ماہر اور ایک بہت طاقت ور شخصیت ہے جس کے تعلقات اعلیٰ ترین شخصیات سے ہیں۔ پنڈتوں کی طرح زرد پگڑی پہنتا ہے اور اس کے چہرے پر سب سے عجیب چیز اس کی آنکھیں ہیں۔ کہانی فریدی کے والد کے دوست اور محکمے میں استاد جیسے بزرگ عرفانی کی ہلاکت سے شروع ہوتی ہے اور ایسے واقعات پر ختم ہوتی ہے کہ عقل بے حد تماشا ناول صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ناول ابن صفی کا وہ پہلا ناول ہے جس میں کسی بین الاقوامی تنظیم کی سیاہ کاریوں کا ذکر ہے۔ "جنگل کی آگ" میں دیو اللہ شاستری اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ حکومت ان کا حق ہے جو طاقت ور ہیں۔ جی ہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس ناول میں بھی سائنسی ایجادات اور حیرت انگیز مشینوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس ناول کو اردو میں سائنس فکشن کی اعلیٰ داستانوں میں سے ایک بنا تے ہیں۔ اس ناول میں ایسے درندوں کا ذکر ملتا ہے جو انسانی اجسام سے تیار کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسی مشین جس میں انسانوں اور ایک معمولی بندر کو بند کریں تو ایک دیو قامت بن مانس تیار ہو جاتا ہے۔ ارتقا کا عمل جو صدیوں پر محیط ہے وہ دیو اللہ شاستری کی تنظیم لمحوں میں مکمل کر لیتی ہے۔ سائنسی طور پر ترقی یافتہ یہ تنظیم انتہائی ترقی یافتہ ہے اور نہ جانے کتنے مہلک اور جدید ہتھیار اور مشینیں بنا چکی ہے۔ کہانی کے آخر میں شاستری اور اس کے کارندے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم ان کا ایک اہم ذاتی اور ان کے عزائم دنیا پر عیاں ہو جاتے ہیں۔

موت کی چٹان

"جنگل کی آگ" سے شروع ہونے والی کہانی "موت کی چٹان" میں آ کر مکمل ہو جاتی ہے۔ اس بار آخری معرکہ رام گڑھ کی پہاڑیوں میں ہوتا ہے۔ فروری ۱۹۵۵ء سے شروع ہونے والی کہانی جون ۱۹۵۵ء میں مکمل ہوئی۔ اس بار کہانی ایک قتل کی تفتیش سے شروع ہو کر دیو اللہ شاستری کی گرفتاری پر ختم ہوتی ہے۔ اس تنظیم اور شاستری پر قابو پانے پر حکومت فریدی کو اعزازی کرنل اور حمید کو اعزازی کیپٹن کا عہدہ تفویض کرتی ہے۔

خونی بگولے

"نیلی لکیر" سے شروع ہونے والی کہانی خونی بگولے (اکتوبر ۱۹۵۵ء) میں بھی جاری رہتی ہے۔ ابن صفی اس کہانی میں جنوبی امریکہ کے ممالک، ایکواڈور اور برازیل وغیرہ کی سیر کرواتے ہیں۔ "نیلی لکیر"

میں بازیاب کروایا جانے والا زیور ایک بار پھر سنگ ہی کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اس پر لکھی تحریر کے مطابق یہ ہوازیل کے دور دراز علاقے تاریک وادی میں مدفون ایک خزانے کا نقشہ ہے۔ تاریک وادی گنجان جنگلوں میں واقع ایسی جگہ ہے جو ایک دو ہزار فٹ گہری کھائی میں موجود ہے اور جہاں مکمل طور پر انکا قوم کے خزانے کی موجودگی ہو سکتی ہے۔ یہ کہانی ابن صفی کے زورِ قلم اور وسیع اور عمیق مطالعے کا ٹھوس ثبوت ہے۔ کہانی میں نفسیات، ہپناٹزم، جنوبی امریکی ممالک کے حالات، رہن سہن اور وہاں بولی جانے والی بولیاں، وہاں کے جانور غرض ہر لحاظ سے اس ناول کو ابن صفی کی تخلیقات میں ایک اونچا مقام دلواتے ہیں۔

شعلوں کا ناچ

شعلوں کا ناچ فریدی سیریز کے ناولوں میں ایک اور ناقابل یقین اور ناقابل فراموش داستان ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی اشاعت کے بعد ابن صفی کی تخلیقات کو غیر معمولی پذیرائی ملی اور یہی وہ کتاب ہے جس پر پہلی بار ابن صفی کی تصویر شائع ہوئی۔ اس کی تاریخ جناب خرم علی شفیق بیان کرتے ہیں:

> ''جنوری ۱۹۵۲ء میں جب ابن صفی کے ناول الٰہ آباد سے شائع ہونے شروع ہوئے تو انھیں ناول کی بجائے ماہنامے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس ماہنامے کا نام ''جاسوسی دنیا'' تھا اور ایک ماہنامے کے طور پر ہی اس کی رجسٹریشن ہوئی تھی۔ بہر حال ماہنامہ ہونے کی وجہ سے ادارہ نکہت کو جاسوسی دنیا کے ایک شمارے کی ترسیل پر صرف ایک پیسے کا ٹکٹ لگانا پڑتا تھا ورنہ چھ سات پیسے کے ٹکٹ لگانا پڑتے۔ یہ رعایت اس وقت زیادہ اہم ہو گئی جب جاسوسی دنیا کی ماہانہ اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی اور یہ اردو زبان میں شائع ہونے والا ماہنامہ بن گیا۔ (اس زمانے میں جاسوسی دنیا کا ہر شمارہ اپنی مقررہ تاریخ سے پندرہ روز قبل شائع ہوتا تھا۔ مارچ ۱۹۵۳ء کا شمارہ پچیسواں یعنی سلور جوبلی شمارہ تھا۔ یہ دو رنگوں کی چھپائی اور تصویری خاکوں سے مزین تھا۔ سرورق نفیس کاغذ پر چھپا اور ضخامت بھی غیر معمولی تھی کیوں کہ ''خاص نمبر'' تھا۔ اس کے باوجود اس کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی (اس زمانے میں جاسوسی دنیا کے عام شمارے کی قیمت نو آنے اور خاص نمبر کی ایک روپیہ ہوتی تھی)۔ سلور جوبلی کی تزئین و آرائش اور کم قیمت نے بھی [illegible] میں مبتلا کیا۔ مگر بدقسمتی سے کچھ ماہ بعد ستمبر ۱۹۵۳ء میں

جاسوسی دنیا کو محکمہ ڈاک کی طرف سے حکم نامہ موصول ہوا کہ ماہنامے میں حالاتِ حاضرہ اور افکارِ تازہ کی شمولیت ضروری ہے ورنہ خصوصی اجازت نامہ منسوخ ہو جائے گا اور زیادہ قیمت کے ٹکٹ لگانے پڑیں گے۔ ماہنامے کی کم قیمت کی وجہ سے ادارہ نکہت زیادہ قیمت کے ٹکٹوں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا لہٰذا جاسوسی دنیا میں تبصرے، حالاتِ حاضرہ اور ایک قسط وار مضمون کا اضافہ کر دیا گیا۔ گوشۂ احباب کا بھی اضافہ ہوا اور کبھی کبھی ایک نظم بھی شائع ہونے لگی (ایک ناول کے ساتھ جوش ملیح آبادی کی نظم بھی چھپی)۔ یہ تمام بھرتی کی چیزیں چند صفحات میں نمٹ جاتی تھیں اور اصل چیز یعنی ابن صفی کا ناول جس کی وجہ سے لوگ ہر مہینے یہ شمارہ خریدتے تھے وہی زیادہ صفحات کو محیط ہوتا تھا۔ اس کے بعد ادارہ نکہت کو محکمہ ڈاک کی طرف سے نیا حکم نامہ موصول ہوا جس کے مطابق کم سے کم پچاس فیصد مواد اخباری نوعیت کا ہونا ضروری تھا۔ اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکی اور فروری ۱۹۵۵ء میں پوسٹ ماسٹر یوپی کے حکم سے جاسوسی دنیا کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا۔ تازہ شمارہ شائع ہو چکا تھا مگر اس کی روانگی ملتوی کر کے ادارے نے دستورِ ہند کی دفعہ ۲۲۶ کے تحت الٰہ آباد کی عدالت میں عرضداشت پیش کی۔ ۲۱ مارچ کو عدالت نے حکم امتناعی جاری کیا جس کے دو روز بعد شمارہ روانہ ہوا۔

اس کے بعد شمارے دوبارہ وقت پر آنے لگے۔ ۱۴ ستمبر سے عدالت میں بحث کا آغاز ہوا جس میں ادارہ نکہت کے وکیل ستیش چندر کھرے تھے۔ ۲۱ اکتوبر کو جسٹس مہر ہترا نے ادارہ نکہت کی درخواست منظور کر کے ڈاک خانے کا حکم منسوخ قرار دے دیا۔ اگر زبان و ادب کا کوئی محقق اس عدالتی کارروائی کی روئیداد بازیافت کر کے شائع کر سکے تو شاید اس سے عوامی تاریخ کے ایک اہم باب پر روشنی پڑ سکے یعنی آزادی کے فوراً بعد کے زمانے میں ادب اور صحافت کا باہمی تعلق کیا سمجھا جاتا تھا اور ان کی حدود کس طرح متعین ہوتی تھیں۔ یہ سارا قضیہ اسی بنیاد پر اٹھا تھا کہ جاسوسی دنیا صحافت ہے یا نہیں اور صحافت کو جو

مراعات مل سکتی ہیں وہ ادب کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ اس دوران
میں ادارے کی طرف سے کئی بار اعلان ہو چکا تھا کہ مارچ ۱۹۵۹ء کا شمارہ جو ۲۵؍
فروری کو شائع ہوگا وہ گولڈن جوبلی نمبر ہوگا (یہ اعلان جولائی ۱۹۵۵ء سے شروع
ہوا تھا)۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ پچاسواں شمارہ بنتا تھا۔ عباس حسینی کے بیان
کے مطابق ہزاروں کی تعداد میں مشوروں کے خطوط آنا شروع ہو گئے تھے۔ ابن
صفی نے بھی خاص الخاص کہانی "شعلوں کا ناچ" لکھی تھی اور واقعی یہ عام
کہانیوں سے زیادہ متاثر کرنے والی تھی۔ طباعت کے معاملے میں اسے سلور
جوبلی نمبر سے بھی بہتر ہونا تھا چنانچہ اس دفعہ صرف خاکوں کی بجائے اچھی
خاصی تصویریں بنوائی گئیں۔ اسی دوران میں نہ جانے کیا ہوا کہ یکم جنوری
۱۹۵۹ء کو محکمہ ڈاک کی طرف سے ایک دفعہ پھر رجسٹریشن نمبر کی منسوخی کا حکم
آ گیا۔ اس کی تفصیل پر عباس حسینی کے اداریوں سے بھی روشنی نہیں پڑتی ہے۔
ممکن ہے محکمہ ڈاک نے عدالت میں اپیل کی ہو یا کوئی اور قانونی پہلو نکلا ہو۔
بہرحال رجسٹریشن کی منسوخی کی وجہ سے شمارے کی وسیع پیمانے پر ترسیل مشکل تھی
اور گولڈن جوبلی نمبر ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عباس حسینی
نے ابن صفی کو کراچی خط لکھ کر کہا ہوگا کہ اگلا ناول تیار ہو تو بھیج دیا جائے تا کہ
اُسے پہلے شائع کیا جائے یا پھر کوئی متبادل ناول بھیجا جائے۔ ابن صفی نے عمران
سیریز کا تازہ ناول "بھیانک آدمی" بھیجا ہوگا اور یوں انچاسویں شمارے کے طور
پر "شعلوں کا ناچ" کی جگہ ایک عمران سیریز کا جو تھا ناول پیش ہو گیا۔
معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ابن صفی فریدی اور حمید کا ایک اور ناول لکھ کر بھیج
چکے تھے اور یہ "پاگل خانے کا قیدی" تھا۔ رجسٹریشن نمبر بحال نہ ہوا تھا لہٰذا
اپریل کے شمارے کے طور پر یہی ناول پیش کر دیا گیا اور عباس حسینی نے اداریے
میں لکھا: "رجسٹریشن نمبر کی اس غیر یقینی صورت حال کے باوجود یہ فیصلہ کیا جا چکا
ہے کہ جو کچھ بھی ہو گولڈن جوبلی نمبر "شعلوں کا ناچ" آئندہ ماہ ضرور شائع ہو
گا۔ یہ فیصلہ بھی آپ کی بے چینیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے"۔ اس طرح

۱۵ اپریل گولڈن جوبلی نمبر کی اشاعت کی تاریخ قرار پائی مگر اس تاریخ تک کاپی تیار نہ ہو سکی۔ اب دو رنگوں کے خصوصی پوسٹر شائع کروائے گئے جن پر گولڈن جوبلی کے لیے ۲۵ اپریل کی تاریخ اشاعت کا اعلان تھا مگر ۲۰ اپریل سے پہلے پرنٹنگ مکمل نہ ہو سکی۔ اس دوران میں لوگوں نے نہ صرف تار اور خط کے ذریعے بلکہ دور دراز مقامات سے الہ آباد پہنچ کر ادارہ نکہت کے دفتر میں ذاتی طور پر آ کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

اس قدر طویل انتظار کے بعد جب یہ گولڈن جوبلی نمبر کتب فروشوں کے پاس پہنچا تو کچھ ایسا ہوا جس کی امید عباس حسینی اور ابن صفی کو بھی نہیں تھی۔ گولڈن جوبلی نمبر اردو کی صحافتی تاریخ میں امید اور روشن مستقبل کے ایک زریں دور کا آغاز کرتا ہے۔ عباس حسینی نے اگلے شمارے "گیارھواں زینہ" کے اداریے میں لکھا:

"شائع ہونے سے قبل اس کی تیاری اور اس کا انتظار ایک کہانی تھی اور اشاعت کے بعد اس کی مقبولیت ایک ایسا افسانہ بن چکی ہے جو صداقت پہ بنی ہے۔ اس کا سواگت کس طرح کیا گیا ہے، اس کا نظارہ ماضی کی ان ابتدائی تاریخوں میں ہوا جب جوبلی نمبر کتب فروشوں کی دکانوں پر پہنچا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ امتحان کے نتیجے کے دنوں میں یا جنگ کے زمانہ میں راشن کی دکانوں پر بھی لوگوں کی ایسی بےقراری اور بے چینی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں خود بھی اس بے مثال، عدیم النظیر اور گرم جوشی سے خیر مقدم کا اندازہ نہیں تھا۔ اور آج جوبلی نمبر کو شائع ہوئے صرف دس دن ہوئے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں مقررہ نمبر سے زیادہ چھپوانے کے بعد بھی دفتر میں ایک بھی کاپی نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے ایجنٹوں کے خطوط اور تار سامنے رکھے ہیں جن کی دوبارہ فرمائش پوری نہیں کی جا سکی۔ ہزاروں کی تعداد میں خطوط کا ایک ڈھیر ہے جو پھیلا ہوا ہے"۔ "گیارھواں زینہ" کے "گوشہ احباب" کی تمہید میں ادارے کی جانب سے لکھا گیا: "ایشیا کے ہر گوشے سے نوزائیدہ ایجنٹوں نے جس طرح تار اور خط کے ذریعے ہماری ہمت افزائی کی اور جاسوسی دنیا کو یورپ کی شائع شدہ کتابوں کا

ہم پلہ قرار دیا ہم اس کے لیے شکر گزار ہیں۔ جوبلی نمبر کے سلسلے میں مدح و ثنا و تعریف و توصیف تنقید نے جو ایک قیامت خیز صورت اختیار کی ہے ان تمام کی اشاعت ناممکن ہے۔"[۱]

"شعلوں کا ناچ" وہ پہلا ناول تھا جس میں ابن صفی کی تصویر شائع ہوئی۔ کتاب میں اس کی بڑی دلچسپ وجہ بیان کی گئی ہے:

"ابن صفی کی تصویر

گذشتہ کئی شماروں سے گوشہ احباب کے عنوان کے تحت ہزاروں خطوط ابن صفی کی تصویر کے لیے آئے اور جوبلی نمبر کے اعلان کے بعد سے تو خطوط کا ایک سیلاب تھا جو تھمتا ہی نہیں تھا۔ حال ہی میں گورنمنٹ ہائی سکول نظام آباد دکن کے تین سو اسی ۳۸۰ طلبا کا ایک دستخطی میمورنڈم اور دوسرے تین پچیس اور سو دستخطوں کے میمورنڈم کے ساتھ موصول ہوا۔ ظاہر ہے رائے عامہ کے اس طوفان کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا اس لیے محترم ابن صفی کی تصویر جوبلی نمبر میں شائع کی جا رہی ہے۔ ادارہ تصویر کی اشاعت کا مطالبہ کرنے والوں اور لاکھوں قارئین کی خدمت میں اس زبردست خوش نصیبی پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ادارہ"[۲]

خرم علی شفیق "شعلوں کا ناچ" کی غیر معمولی پذیرائی کی وجہ اور اس سے اگلی کتب پر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"شعلوں کا ناچ" کی کامیابی میں اس غیر معمولی انتظار کا بھی دخل تھا جو جاسوسی دنیا کے قارئین کو اس شمارے کے لیے کرنا پڑا۔ یہ انتظار تو ہوا تھا مگر کیا ادارہ نکہت جان بوجھ کر بھی اپنے قارئین کو انتظار کروا سکتا تھا؟ اس کا طریقہ ابن صفی نے چند ماہ بعد یہ نکالا کہ سلسلہ وار کہانی لکھ ڈالی۔ سلسلہ وار کہانی لکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ابن صفی کو اپنا کینوس وسیع کرنے کا موقع ملا۔ ایک عام شمارے میں کہانی کے صفحات سو سے کچھ اوپر ہوتے تھے اور خاص نمبر میں ڈیڑھ دو سو کے قریب۔ ظاہر ہے کہ چھوٹے سائز کے یہ صفحات ایک بھرپور ناول کے لیے کافی نہیں تھے۔ چناں چہ اس کے بعد ابن صفی نے جتنے بھی ایسے سلسلے لکھے جو چار دیا

زیادہ ناولوں کو محیط ہیں وہ ان کے بقیہ ناولوں میں ممتاز دکھائی دیتے ہیں اور
صحیح معنوں میں اس دنیا کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو ابن صفی کے ذہن میں تھی۔
سلسلہ وار ناولوں میں اس کی بھی گنجائش تھی کہ قارئین کہانی کے درمیان میں رائے
دیتے جائیں اور اس رائے کی روشنی میں کہانی لکھی جائے۔ ابن صفی اس لحاظ سے
بھی ذرا مختلف قسم کے مصنف تھے کہ وہ قارئین کی رائے کو غیر معمولی اہمیت دیتے
تھے۔ اس لحاظ سے بھی چار یا زیادہ ناولوں والے سلسلے ایک منفرد خصوصیت رکھتے
ہیں کہ یہ ایک طرح سے مصنف اور قارئین کی مشترکہ تخلیق ہیں۔" [۳]

"شعلوں کا ناچ" کی کہانی ایک ایسی تنظیم کے گرد گھومتی ہے جو طاقت کی پجاری ہے اور جس کا مقصد صرف اور صرف طاقت کی حکمرانی ہے۔ اس تنظیم کے فلسفے کے مطابق کم زوروں کو حکمرانی کا کوئی حق حاصل نہیں وہ صرف غلامی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس تنظیم کے آلہ کاروں میں معاشرے کے معززین شامل ہیں جو مختلف طریقوں سے اپنے ہی ملک کو کم زور کرنے کی سازش میں ملوث ہیں۔ اس کہانی میں بھی سائنسی ایجادات کی ایک نئی دنیا ہمارے سامنے آتی ہے۔ شہر کو تباہ کر دینے والے لرزہ خیز [illegible] اور ایسی روشنی جس سے جسم کی قوت سلب ہو جائے اس کی مثال ہیں۔ یہ کہانی ابن صفی کے شہ پاروں میں شامل ہے جو ان کی جاسوسی تخلیقات میں ایک نیا سنگ میل ثابت ہوئی۔

شعلوں کا سیٹ

شعلوں کا سیٹ دراصل چار ناولوں کا مجموعہ ہے۔ ان ناولوں میں "پہلا شعلہ (ستمبر ۱۹۵۹ء)"، "دوسرا شعلہ (اکتوبر ۱۹۵۹ء)"، "تیسرا شعلہ (نومبر ۱۹۵۹ء)" اور آخری حصہ جس پر اس کہانی کا اختتام ہوا "جہنم کا شعلہ (دسمبر ۱۹۵۹ء)" شامل ہیں۔ مختصر کردہ اقتباس میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں ابن صفی نے سلسلہ وار ناول لکھے اور شعلوں کا سیٹ اس سلسلے میں سنگ میل کا مقام رکھتا ہے۔ یہ کہانی بھی طاقت تنظیم کے سلسلے کی کہانی ہے جس میں بہت سی کہانیاں منسلک ہیں۔ اس کہانی میں ابن صفی نے چند لازوال کردار پیش کیے جن میں تھریسیا اور ساحرہ شامل ہیں۔ تھریسیا ایک اذیت پسند عورت ہے جو بیک وقت جنسی کج روی Masochist اور اذیت پسندی Sadist جیسے رجحانات کی حامل ہے۔ ساحرہ ایک انتہائی قاتل اور صاحب مطالعہ ہستی ہے جو فلسفے کو مہمل قرار دیتی ہے۔ اس داستان کا مرکزی خیال طاقت ور مجرم تنظیموں کی ریشہ دوانیاں اور پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو اپنے زیر تسلط لانا ہے۔ ایسی

تنظیمیں بڑے پیمانے پر جعلی کرنسی، اغوا اور قتل و غارت جیسے مکروہ کام کرتی ہیں تا کہ ان کے مذموم مقاصد کامیاب ہو سکیں۔ ان تنظیموں کا مقصد اپنی باطنی حکومت قائم کرنا ہے۔ بلاشبہ یہ پوری کہانی ایسے محیر العقول واقعات اور ایجادات سے پُر ہے جو اس سے پہلے جاسوسی ادب کے منظر نامے پر دیکھنے کو نہیں ملے۔

ڈاکٹر ڈریڈ سیریز

ڈاکٹر ڈریڈ سیریز بھی چار ناولوں پر مشتمل ایک سلسلہ ہے جس میں ہر ناول ایک مکمل کہانی پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں پہلا ناول "زہریلے تیر (جنوری ۱۹۵۵ء)"، دوسرا "پانی کا دھواں (فروری ۱۹۵۵ء)"، تیسرا "لاش کا قہقہہ (مارچ ۱۹۵۵ء)" اور چوتھا اور آخری ناول "ڈاکٹر ڈریڈ (اپریل ۱۹۵۵ء)" شامل ہیں۔ اس کہانی میں جس کردار نے قارئین کی توجہ حاصل کی وہ گِنج ہے جو چھوٹے قد اور جبڑوں کی ساخت کے باعث بندر سے مشابہہ ہوتا ہے۔ گنج نیو میکسیکو کا باشندہ ہے اور نسلاً پرتگالی ہے۔ جانوروں کا بہروپ بھرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور ایک سرکس میں کام کرتا رہا ہے۔ وہ جمناسٹک کا ماہر ہے اور ساتھ ہی ساتھ کئی زبانیں اہل زبان کی طرح بول سکتا ہے۔ گنج کا کردار کئی ناولوں میں متعارف ہوتا رہا ہے اور اسے بہت پذیرائی ملتی رہی ہے۔ شمالی امریکا سے تعلق رکھنے والا ڈاکٹر ڈریڈ ایک بے حد خطرناک مجرم ہے جو زہروں کے استعمال کا ماہر ہے۔ اس کہانی میں ابن صفی تیسری دنیا کے حالات بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ترقی یافتہ ممالک کی مجرم تنظیمیں پس ماندہ ممالک کو اپنا کھاجا بنا لیتی ہیں۔ "زہریلے تیر" میں ابن صفی اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ کس طرح بعض غیر ملکی سفارت خانے خفیہ راز معلوم کرنے کے لیے مختلف حربوں کا استعمال کرتے ہیں اور سب سے کامیاب حربہ ہمیشہ سے ایک ہی رہا اور وہ ہے عورت۔ کہانی کی ایک اور خاص بات میک اپ کے متعلق ابن صفی کی معلومات ہیں۔ اس کہانی میں ابن صفی انسانی فطرت کی ان سچائیوں اور گھناؤنی حرکات کا ذکر کرتے ہیں جن کو پڑھ کر اسے انسان کہنے کو دل نہیں کرتا۔ یہ کہانی فریدی کی ذہنی صلاحیتوں اور اس کے بچھائے ہوئے جال کی ایسی کہانی ہے جس میں آ کر لیونارڈ اور شاستری اور طاقت جیسی تنظیمیں فنا ہو گئیں۔ کہانی کا مقصد یہ ہے کہ جب تک تیسری دنیا کے ممالک معاشی و سائنسی ترقی نہیں کریں گے اس وقت تک مغربی اقوام انھیں اسی طرح استعمال کرتی رہیں گی اور ان ممالک کی قیمتی معدنیات سے مالا مال زمین کو لوٹتی رہیں گی۔

زمین کے بادل

زمین کے بادل ابن صفی کا ایک اور شاہکار ہے جس میں پہلی بار فریدی اور عمران پہلی اور آخری بار جلوہ گر ہوئے۔ ابن صفی نے ایک خفیہ تنظیم زیرولینڈ کا تذکرہ عمران سیریز کے ناول "پیاسا سمندر" میں کیا تھا۔ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو سائنسی طور پر بے حد ترقی یافتہ ہے اور انتہائی خاموشی سے اپنی قوت بڑھانے میں مصروف عمل ہے۔ اس کہانی میں زیرولینڈ کی انتہائی جدید سائنسی ایجادات خاص طور پر اڑن طشتری جسے وہ "نے گراز" کہتے ہیں خاصے کی چیز ہیں۔ اس ناول میں ابن صفی نے قارئین کے بے پناہ اصرار پر فریدی اور عمران کو اکٹھا کیا۔ اس ناول کے بعد انھوں نے ان دونوں کو کبھی اکٹھا نہیں کیا۔

طوفان کا اغوا

"طوفان کا اغوا" اگست ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کہانی میں ابن صفی نے فولادی کو متعارف کروایا۔ یہ ایک ایسا روبوٹ ہے جو جیٹ پیک کی روانی کو بحال رکھتا ہے جو کئی تجربات اور یہاں تک کہ طوفانوں پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ اس کے گرد نظر آنے والی لہروں کا ایک جال ہے جس سے اس کی طرف آنے والی ہر چیز خواہ وہ گولی ہو یا میزائل واپس پلٹ جاتے ہیں۔ یہ کہانی بھی جاسوسی ادب میں سائنس فکشن کا ایک انوکھا پہلو تھا جس میں پہلی بار وائرلیس ریڈیو کی لہروں کی سمت کے ذریعے اس کے مخرج تک پہنچنا دکھایا گیا۔ گو آج ایسے بہت سے روبوٹ عام ہیں جو انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں مگر اس دور کا اندازہ کیجیے جب فولادی محض ایک نظریہ تھا اور کئی عرصے بعد ایک ادیب کے تخیل نے حقیقت کا روپ دھارا۔

چاندنی کا دھواں

اگست ۱۹۵۸ء میں آنے والا یہ ناول ابن صفی کے قلم کا ایک اور شاہکار ہے جس میں سائنس فکشن، زیرولینڈ اور انسانی نفسیات کا ایک عجیب سا امتزاج ہے۔ وادی کا جیک میں حمید، قاسم اور فریدی کے ناقابل فراموش کارنامے اور نفسیاتی طریقوں سے زیرولینڈ کی ایک بڑی ہستی ماتونہ کی گرفتاری عمل میں آتی ہے۔ کہانی میں ایک بار پھر پس ماندہ ممالک کی قیمتی معدنیات لوٹتے ہوئے دکھائی گئی ہیں کہ کس طرح ترقی یافتہ مجرم تنظیمیں ملکوں کو نقصان پہنچاتی رہتی ہیں۔ اس بار بھی زیرولینڈ کا مقصد وادی کا جیک سے ایک نایاب ترین ایندھن لے کر جانا تھا جسے وہ لمبی پروازوں اور خاص طور پر دوسرے سیاروں پر جانے کے لیے استعمال کریں گے۔ یہ ایندھن یورینیم سے کئی ہزار گنا بالا اور سریع الاثر ہوتا ہے۔ اس ناول میں ایسے آلات کا ذکر ہے جنھیں آج Bunker Buster کہا جاتا ہے۔ راکٹ کے آگے ایسے آلات ہیں

جو پتھروں کو پگھلا دیتے ہیں اور راکٹ اس نرم زمین سے آرام سے گزر جاتا ہے۔ آج Bunker Buster بھی اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔ اس ناول میں ایک ایسی سائنسی مشین دکھائی گئی ہے جو آج کے Hologram سے ملتی جلتی ہے کہ انسان کی شبیہ بالکل اصل حالت میں کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔ پورا ناول بہت ہی دل چسپیوں اور تجربوں کا مجموعہ ہے

لڑاکوں کی بستی

"لڑاکوں کی بستی" سراغ رسانی کا ایک مرقع ہے مگر اس کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ آج ہم Match Fixing اور سٹے بازی جیسی اصطلاحات روز ہی سنتے ہیں اور کوئی کھیل اس سے محفوظ نہیں۔ ابن صفی نے پہلی بار اس موضوع کو ۱۹۵۷ء میں اجاگر کیا تھا۔ کہانی کشتی جیسے کھیل پر چلی ہے جس میں ایک پہلوان جان بوجھ کر ہار جاتا ہے تو کئی لوگوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ یہ ناول لکھتے وقت انھیں کیا پتا تھا کہ آنے والے وقت میں سٹے بازی اور Match Fixing ایک ناسور کی طرح بہت سے کھیلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

چمکیلا غبار

مئی ۱۹۵۹ء میں شائع ہونے والا یہ ناول سائنس فکشن میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس ناول میں فنچ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کئی غیر ملکی ایجنٹ ایک ایجاد چرانے کے سلسلے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ ایجاد دراصل جس کا تذکرہ از حد ضروری ہے Multi Ammunition Softkill System کے اصول پر کام کرتا ہے۔ اس اصول کے مطابق جب کوئی میزائل کسی ہوائی یا بحری جہاز کی طرف آتا ہے تو جہاز سے چند دھاتی ٹکڑے نکلتے ہیں جس سے میزائل بجائے جہاز سے ٹکرانے کے ان دھاتی ٹکڑوں سے ٹکرا جاتا ہے اور جہاز اس حملے سے بچ جاتا ہے۔ اس ناول میں ایسی ہی ایجاد دکھائی جاتی ہے جو فنچ لے اڑتا ہے۔ فریدی اسے بڑی حکمت سے قابو کرتا ہے اور اس بار اسے اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔

ساتواں جزیرہ اور شیطانی کھیل

یہ دونوں ناول (جنوری مارچ ۱۹۹۵ء) ایک جاسوسی ناول نگار کے گرد گھومتے ہیں جو منشیات کے ایک بہت بڑے گروہ کا سرغنہ بھی ہے۔ اس کہانی میں مجرم غیر ملکی نہیں بلکہ ایک مقامی آدمی ہے۔ یہ کہانی ان فرشتہ صورت انسانوں کے بارے میں ہے جن کے باطن انتہائی مکروہ ہوتے ہیں۔ ہر ناول

میں ایک ہی بات سامنے آتی ہے یعنی دولت اور طاقت کا نشہ۔ انھیں حاصل کرنے کے لیے ایک انسان
کس حد تک گر سکتا ہے یہ دونوں ناول اس کے عکاس ہیں۔

سہمی ہوئی لڑکی اور قاتل کا ہاتھ

ان دونوں ناولوں (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) میں "ساتواں جزیرہ" اور "شیطانی جھیل" کے مجرم کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ پچھلے ناولوں میں مجرم کی سمگلنگ کے گروہ کے بارے میں پتہ چلتا ہے مگر اس ناول میں وہ ایک بہت بڑی تنظیم کا سربراہ ثابت ہوتا ہے جو معاشرے میں منشیات کی صورت میں موت تقسیم کر رہے ہیں۔ کہانی میں مزاح اس وقت عروج پر پہنچتا ہے جب حمید ٹیلرنگ شاپ قائم کرتا ہے اور قاسم ایک عورت کے روپ میں بطور ماڈل کام کرتا ہے۔ یہ کہانی بھی کئی تجربات کو جنم دیتی ہے۔ جن میں منشیات کی ترسیل کے ایسے ذریعے دکھائے گئے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔

دیو پیکر درندہ

ویسے تو ابن صفی کا ہر ناول ایک انوکھی اور اچھوتی کہانی پیش کرتا ہے مگر "دیو پیکر درندہ" تمام کہانیوں سے الگ ایک نیا سائنسی نظریہ پیش کرتا ہے اور وہ ہے ذہنوں کی تبدیلی یعنی ایک شخص کا دماغ کسی دوسرے شخص کے دماغ میں رکھ دیا جانا۔ گو ۱۹۶۷ء میں یہ چیز صرف ایک دیوانے کی بڑ نظر آتی تھی مگر کتنے ہی تصورات تھے جب وہ پیش ہوئے تو انھیں تخیل کا شاخسانہ بتلایا گیا مگر تھوڑے عرصے بعد ان کی افادیت سب پر آشکار ہو گئی۔ یہ کہانی بھی ایسا ہی منظرنامہ دکھاتی ہے جو ایک ادیب کے تخیل کی پرواز کی اونچائی کو سامنے لاتی ہے۔

جابی کا خواب اور جنگ شناسائی

یہ دونوں ناول (اکتوبر، نومبر ۱۹۶۸ء) بھی زیرو لینڈ سلسلے کے ناول ہیں جس میں ناٹوتا ایک دفعہ پھر فریدی سے ٹکراتی ہے۔ فریدی اس بار بھی ذہنی لڑائی کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی پوری کہانی پر چھایا نظر آتا ہے۔ دونوں ناول ابن صفی کا مخصوص رنگ لیے ہوئے ہیں جن میں سائنس فکشن کے ساتھ ساتھ سراغ رسانی اور ذہنی جنگ عروج پر نظر آتی ہیں۔ ناول کے آخر میں فریدی بالآخر ناٹوتا کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ان ناولوں کے بعد "شوقی ریشے" (ستمبر ۱۹۶۹ء)، "تیسری ناگن" (نومبر ۱۹۶۹ء) اور "ریکم بالا" (جنوری ۱۹۷۰ء) بھی زیرو لینڈ سیریز کے ناول ہیں۔ ان ناولوں میں بھی کئی سائنسی شعبدے اور نفسیاتی حربوں کا ذکر ہے جن سے ابن صفی کے قلم کی تخلیقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

زہریلا سیارہ

فروری ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والا یہ ناول زیرو لینڈ سیریز میں ایک شاہکار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کہانی میں ایک مصنوعی سیارے کا ذکر ہے جس کی مدد سے زیرو لینڈ بہت سی تباہیاں لا سکتا ہے۔ زیرو لینڈ نے اس مصنوعی اور زہریلے سیارے کا کنٹرولنگ سٹیشن رام گڑھ کی پہاڑیوں میں بنایا ہوا ہے۔ اس بار زیرو لینڈ کھل کر پوری دنیا کے سامنے آتا ہے۔ خلا میں اپنا سیارہ چھوڑنے کے بعد وہ اعلانیہ عالمی طاقتوں کے بڑی جیو زنیاو کر دیتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ اگر انھوں نے زیرو لینڈ کے ایجنٹ نہ چھوڑے تو وہ ان کے خفیہ میزائلوں کے اڈوں کے بارے میں سب کو بتا دے گا۔ زیرو لینڈ والے ایک بار پھر فریدی کے ملک سے اس مصنوعی سیارے کے لیے ایک ایندھن چراتے ہیں اور اسی کے ملک میں مصنوعی سیارے کا کنٹرولنگ سٹیشن بنا دیتے ہیں۔ اپنے سائنسی آلات، تجربہ در تجربہ پلاٹ اور دیگر دلچسپیوں کی بدولت یہ ناول ابن صفی کے قلم سے نکلا ایک شاہکار ہے۔

ہم زاد کا مسکن سیریز

ہم زاد کا مسکن سیریز ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا ایک اور شاہکار سلسلہ ہے جس میں سائنس فکشن ایک نئی بلندی کو چھوتا ہے۔ یہ سلسلہ چار ناولوں پر مشتمل ہے اس میں پہلا ناول "شکاری پرچھائیاں (جنوری ۱۹۷۸ء)"، دوسرا ناول "پرچھائیوں کے حملے (فروری ۱۹۷۸ء)"، تیسرا ناول "سایوں کا ٹکراؤ (اپریل ۱۹۷۸ء)" اور یہ داستان "ہم زاد کا مسکن (جون ۱۹۷۸ء)" میں مکمل ہوتی ہے۔ اس کہانی میں بھی طاقت ور ملکوں کو تیسری دنیا کی اقوام کو اپنا آلہ کار بناتا اور ان کے ممالک کو اپنا اکھاڑہ بناتا دکھایا گیا ہے۔ بغیر ڈرائیور چلنے والی کار، مستقبل کا حال بتانے والا کمپیوٹر اور طاقت ور لاسلکی ٹرانسمیٹر اس ناول کو خاص بناتے ہیں۔ دشمن ایجنٹوں کا اصل مقصد زیر زمین پانی کا ایک طبقہ توڑ کر تیل کے ذخیرے کے ساتھ ملانا تھا تاکہ فریدی کا ملک تیل کے اس ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھائے اور ہمیشہ عالمی طاقتوں کا دست نگر رہے۔ اس کہانی میں ابن صفی ایسے بین الاقوامی گٹھوں کا پردہ چاک کرتے ہیں جو پس ماندہ ممالک کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے اور اس ضمن میں کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔

عمران سیریز

عمران سیریز کا آغاز اگست ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ اپنے پہلے ناول سے ابن صفی کے قارئین دو گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ فریدی پسند تھا اور دوسرا گروہ عمران کا چاہنے والا۔ عمران سیریز میں جہاں ہمیں

سائنسی ایجادات نظر آتی ہیں وہیں بین الاقوامی تنظیموں اور خاص طور پر صیہونی سازشوں کا پردہ چاک کیا گیا۔ عمران سیریز کے اکثر شاہکار ناولوں میں بیرونی ممالک کا تذکرہ ملتا ہے جس سے قاری کو جاسوسی ادب کے ساتھ ساتھ سفرناموں کا لطف بھی ملتا تھا۔ ابن صفی نے ان شہ پاروں میں بقول امراؤ جان ادا "آوارگی میں ہم نے زمانوں کی سیر کی" کی سی سیر کروائی۔ دنیا کے دور دراز گوشے ہوں جیسے تاہیتی یا یورپ، امریکہ ہو یا برازیل ابن صفی کے قارئین ہر جگہ کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتے تھے۔ عمران سیریز کے اہم ترین ناولوں کا تنقیدی جائزہ:

خوفناک عمارت

اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہونے والا ناول "خوفناک عمارت" عمران سیریز کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس ناول میں عمران کا کردار متعارف کروایا گیا۔ کہانی گو سراغ رسی اور ذہنی جنگ کی ایک داستان ہے مگر اس کہانی میں عمران کی ذاتی زندگی کے ایک گوشے کے بارے میں روشنی پڑتی ہے کہ موصوف ایک عدد منگیتر بھی رکھتے تھے جن سے منگنی عمران کی لندن سے واپسی پر ٹوٹ جاتی ہے۔

پراسرار چیخیں

عمران سیریز کے اس ناول (دسمبر ۱۹۵۵ء) میں اسے سرکاری ملازمت کی پیش کش ہوتی ہے بلکہ وزیر داخلہ اسے اپنے دفتر مدعو کر کے محکمہ سراغ رسانی میں ملازمت کی پیش کش کرتے ہیں۔ تاہم اپنی شرائط پر وہ یہ نوکری قبول کر لیتا ہے۔ اس کی شرائط کے مطابق وہ براہ راست ڈائریکٹر جنرل یعنی اپنے والد صاحب کے ماتحت کام کرے گا اور انھی کو جواب دہ ہوگا۔ دوسرے وہ اپنا سیکشن خود ترتیب دے گا اور اپنے لیے سٹاف بھی خود منتخب کرے گا۔

بھیانک آدمی

"بھیانک آدمی" جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع ہونے والا عمران کا چوتھا ناول تھا جسے عباس حسینی کو اپنے ادارے سے ہجرت اور ڈاک خانے کے باہمی تنازعے کی بنا پر فریدی وحمید کی جاسوسی دنیا کے سلسلے کے تحت بطور شمارہ نمبر انچاس شائع کرنا پڑا تھا۔ یہ وہ ناول ہے جس میں عمران کی ملاقات روشی سے ہوتی ہے۔ مشن کے خاتمے کے بعد روشی بھی عمران کے ساتھ اس کے شہر چلی آتی ہے۔

جہنم کی رقاصہ

عمران سیریز کا یہ ناول (فروری ۱۹۵۶ء) کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اول اس ناول میں

عمران اپنے والد کے ایما پر سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیتا ہے۔ دوم، روشی کی وجہ سے اس کے والد اسے گھر سے بھی نکال دیتے ہیں۔ سوم، یہ پہلا ناول ہے جس میں ابن صفی نے کمیونزم، مادیت اور اس کے پیروکاروں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ایک اور ناول "ہیروں کا فریب" (نومبر ۱۹۵۹ء)" میں بھی کمیونزم اور دہریت کا پردہ چاک کیا گیا ہے کہ کس طرح کمیونسٹ مایوسی پھیلا کر سادہ لوح نوجوانوں کو خدا کے وجود سے منکر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ناول "پاگلوں کی انجمن (جون ۱۹۶۰ء)" ہے جس میں بھی کمیونزم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

خلیے پر حملے

امریکہ نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عراق پر اس لیے حملہ کیا کہ وہ کیمیاوی ہتھیار رکھنے کے ساتھ ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کا حامل ہے۔ اس جنگ سے تقریباً پچاس برس پہلے ابن صفی نے اس ناول میں ایک کیمیاوی مائع کا ذکر کیا جس کے ذریعے کسی بھی شخص کو جلدی بیماریوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناول (فروری ۱۹۵۹ء) بھی سائنس فکشن پر مشتمل ایک اہم کہانی ہے جس میں عمران کی حماقتیں اور مزاح سونے پہ سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

لاشوں کا بازار

عمران سیریز کا یہ ناول (ستمبر ۱۹۵۹ء) عمران کے لندن میں گزرے زمانے پر روشنی ڈالتا ہے جہاں وہ اپنے والد کے دوست کے گھر میں رہتا ہے۔ یہ عمران سیریز کا وہ پہلا ناول ہے جس میں سنگ ہی سے اس کا ٹاکرا ہوتا ہے۔ یہی وہ ناول ہے جس میں سنگ ہی عمران کو اپنا بھتیجا قرار دیتا ہے۔ کہانی عمران کے انگلینڈ میں گزارے روز و شب کی بڑی دلچسپ داستان ہے۔ عمران اس پیچیدہ اور پرت دار کہانی میں بڑے ڈرامائی انداز میں دشمن پر قابو پاتا ہے۔ پوری کہانی مزاح، سنسنی اور تجسس سے بھرپور ہے۔

رات کا شہزادہ اور دھوئیں کی تحریر

"رات کا شہزادہ" (مئی ۱۹۵۹ء) میں عمران سر سلطان کے ایک ذاتی معاملے میں ان کی مدد کرتا ہے اور ایک ایسے مجرم پر قابو پاتا ہے جو ایک بین الاقوامی بلیک میلر ہے۔ اس معرکے کے بعد سر سلطان عمران کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ محکمۂ خارجہ کی سیکرٹ سروس کا سربراہ بن جائے۔ "دھوئیں کی تحریر" (جون ۱۹۵۹ء) وہ پہلا ناول ہے جس میں عمران بطور ایکس ٹو اپنے آٹھ ماتحتوں سمیت جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس ناول میں پہلی بار ابن صفی نے ایسے انجکشن کا ذکر کیا ہے جس سے انسان کا دماغ کچھ عرصے کے لیے الٹ

جاتا ہے۔ اس بار مجرم ایک سائنس دان ہے جو اپنی ایک ایجاد کو قتل کاموں کے لیے استعمال کرتا ہے۔

درندوں کی بستی

"درندوں کی بستی" عمران سیریز میں پہلا سلسلہ تھا جو چار ناولوں پر مشتمل تھا۔ کہانی "کالے چراغ" (دسمبر ۱۹۵۴ء)، "خون کے پیاسے" (جنوری ۱۹۵۵ء)، "الفانسے" (فروری ۱۹۵۵ء) سے شروع ہو کر "درندوں کی بستی" (مارچ ۱۹۵۵ء) پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ یہ مکمل سیریز بھی ابن صفی کی سب سے زیادہ معروف اور زیادہ بکنے والی کتب Best Sellers میں سے ہے۔ اس ناول میں یورپ سے تعلق رکھنے والے دو مجرموں تھریسیا اور الفانسے کا تذکرہ ہے جس میں تھریسیا وہ کردار ہے جو عمران سیریز کے بہت سے ناولوں میں جلوہ گر ہوا۔ یہ کردار بھی ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ تھریسیا انتہائی چالاک، عیار اور سب سے بڑھ کر کچھ ایسے خد و خال کی مالک ہے کہ ذرا سا ہونٹ کا زاویہ تبدیل کرنے سے پورے نقش بدل جاتے ہیں۔ تھریسیا بے حد حسین ہے مگر اس کا حسن کچھ ایسا ہے کہ اس کے خد و خال بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس کہانی میں ابن صفی نے ایک قبائلی علاقے کا ذکر کیا ہے جو آزاد قبائلی علاقے یا افغانستان سے ملتا جلتا ہے۔ یہ علاقہ شکرال ہے جس کے مختلف حصوں میں مختلف قبائل آباد ہیں جن میں کراغال، مقلاق، چقتاری وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں رہنے والے لوگ بڑے جفاکش، مخلص مگر سادہ لوح ہیں۔ جدید دنیا سے ان کا رابطہ منقطع ہے اور یہ اجنبیوں کا داخلہ اپنی سرزمین پر ناپسند کرتے ہیں۔ تاہم یہ کھیل تماشوں اور خاص طور پر سرکس کے بہت شوقین ہیں۔ اپنی کشید کردہ شراب، جسے تاڑی کہا جاتا ہے، اور خاص طور پر چائے کے بڑے شوقین ہیں جو وہاں بے حد مشکل سے ملتی ہے۔ اس کہانی میں بھی ابن صفی قاری پر یہ بات عیاں کرتے ہیں کہ بین الاقوامی مجرم تنظیمیں اپنے مقاصد کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں یہاں تک کہ پسماندہ قبائلی علاقے بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں۔

پیاسا سمندر

عمران سیریز کا پہلا اور مکمل سائنس فکشن ناول (نومبر ۱۹۵۵ء) ہے جس میں زیرو لینڈ اور ڈاکٹر داور متعارف ہوتے ہیں۔ اس ناول میں تھریسیا سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس بار ابن صفی نے اپنے قلم اور تخیلات کے ایسے کرشمے دکھائے ہیں کہ اس ناول کو طلسم ہوشربا کا سائنسی ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ اس ناول میں ایسی محیر العقول ایجادات سامنے آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ زیرو لینڈ کتنی طاقت ور تنظیم

ہے۔ ان ایجادات میں اڑن طشتریاں، تیز رفتار آب دوز، غوطہ خوری کے جدید ترین لباس، پانی میں کام کرنے والی شعاعیں، روبوٹ، بچے جن میں ٹرانسمیٹر کے ساتھ ساتھ آتش گیر مادہ بھی موجود ہے۔ آج ہم میں سے اکثر مصنوعی سیاروں سے واقف ہیں۔ "پیاسا سمندر" کی کہانی بھی مصنوعی سیاروں کے گرد گھومتی ہے۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ زیرولینڈ پوری دنیا سے سائنس دانوں کی ایجادات چوری کرنے میں بھی ماہر ہے۔

چالیس ایک باون

"چالیس ایک باون (اگست ۱۹۵۸ء)" ابن صفی کے ان ناولوں میں سے ہے، جس میں وہ سمگلنگ اور جعلی کرنسی چھاپنے میں ملوث گروہوں کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ جوزف کا کردار اس ناول میں متعارف ہوا۔

ظلمات کا دیوتا (بوغا) سیریز

"ظلمات کا دیوتا" یعنی بوغا سیریز پانچ ناولوں پر مشتمل ہے۔ ان ناولوں میں "عمران کا اغوا (دسمبر ۱۹۵۸ء)"، "جزیروں کی روح (فروری ۱۹۵۹ء)"، "چیختی روحیں (اپریل ۱۹۵۹ء)"، "خطرناک جواری (جون ۱۹۵۹ء)" اور آخری حصہ "ظلمات کا دیوتا (ستمبر ۱۹۵۹ء)" شامل ہیں۔ یہ ناول بھی زیرولینڈ سے متعلق ہے۔ اس کہانی کا پلاٹ اتنا پیچیدہ اور اس کے کردار اتنے متنوع اور دلچسپ ہیں کہ ہر کردار پر طویل بحث ہو سکتی ہے۔ ان کرداروں میں بوغا، ڈگمو اور دونیکا شامل ہیں۔ یہ سیریز ابن صفی کے ان ناولوں میں سے ہے، جس میں وہ اپنے قاری کو بہت دور دراز جگہوں کی سیر کرواتے ہیں۔ ایسے جزائر جن کے وجود سے آج بھی ایک بڑی تعداد ناآشنا ہے۔ کہانی زیرولینڈ کے ذرائع آمدنی کے گرد گھومتی ہے۔ ان تمام حصوں میں بتایا گیا ہے کہ زیرولینڈ منشیات، اسلحے اور اغوا جیسی سرگرمیوں سے پیسا کماتے ہیں۔ کہانی میں انیٹرو ہیکٹر نامی سائنسی ایجاد کا ذکر ہے جس سے چنگاریاں نکلتی ہیں اور جس چیز پر ڈالی جائے وہ ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔

ڈیڑھ متوالے

"ڈیڑھ متوالے (اکتوبر ۱۹۶۳ء)" ابن صفی کے تخلیقی سفر کا سب سے اہم پڑاؤ ہے۔ اس ناول کی کہانی پہلے دو حصوں "دلچسپ حادثہ (جنوری ۱۹۶۰ء)" اور "بے آواز سیارہ (مارچ ۱۹۶۰ء)" سے شروع ہوتی ہے تاہم اسی دوران میں ابن صفی شدید بیمار ہوئے اور تین سال تک کچھ نہ لکھ پائے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہونے کے بعد "ڈیڑھ متوالے" ان کی پہلی تخلیق تھی۔ یہ ناول ابن صفی کے دوسرے تخلیقی دور کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس ناول میں بہت دلچسپ کردار متعارف کروائے گئے جن میں قابل ذکر کردار کبڑے کا ہے۔ کبڑا ایک انتہائی عیار اور قاتل شخص ہے جو اس کہانی میں بہت سے ناقابل یقین روپ بھرتا ہے۔ عمران کی طرح اسے بھی انسانی نفسیات پر پورا عبور حاصل ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ کہانی میں سائنس فکشن کے عناصر بھی ہیں اور افسانوی مناظر بھی۔ اس ناول میں کہیں مشاعرے ہوتے نظر آتے ہیں تو کہیں امریکی طرز کے دیسی کاؤ بوائز، کہیں ظرافت اپنے عروج پر ہے تو کہیں پُر مزاح گفتگو کہانی کا لطف بڑھا رہی ہے۔ یہ داستان بھی نہ بھلائی جانے والی داستانوں میں سے ایک ہے۔

آتشی بادل سیریز

"آتشی بادل" سیریز تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا "لوبوقی لا" (دسمبر ۱۹۶۵ء)، دوسرا "سہ رنگا شعلہ" (جنوری ۱۹۶۶ء) اور تیسرا "آتشی بادل" (مارچ ۱۹۶۶ء)۔ اس کہانی میں ابن صفی نے غیر ملکی قوتوں کے ہتھکنڈوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ کس طرح یہ قوتیں مختلف توہمات کے جال میں، کسی خیراتی اسپتال کی آڑ میں اور ضمیر فروش لالچی افراد کی مدد سے کسی بھی ملک میں افراتفری اور بے چینی پھیلاتے ہیں۔ خیراتی اسپتال والا پہلو بالکل نیا پہلو تھا کہ مغربی اقوام اس طرح کے اداروں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کہانی میں تجسس اور مزاح کو اس طرح ملایا گیا ہے کہ داستان پوری کیے بنا چین نہ آئے۔ کہانی میں چند سائنسی ایجادات کا ذکر بھی ہے جن میں کسی بھی جاندار کو راکھ بنانے والی مشین قابل ذکر ہے۔ مختلف الوٹ کیمیاوی گیسیں اور ذہنی جنگ اس ناول کو ایک یادگار ناول بناتی ہیں۔

لازوال سیریز

یہ ناول دو حصوں "دوسری آنکھ" (دسمبر ۱۹۶۶ء) اور "آنکھ شعلہ بنی" (جنوری ۱۹۶۷ء) پر مشتمل ہے۔ ابن صفی ایک بار پھر ملک کو غیر یقینی حالات سے دوچار کرنے والوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس بار مجرم ایک غیر ملکی جاسوس ہے جو بڑے عرصے سے بھیس بدل کر اپنے ملک کے لیے جاسوسی کر رہا ہے۔ ابن صفی پچاس کی دہائی سے اپنے قارئین کی فکری اور ذہنی تربیت میں مصروف جہاد رہے۔ انھوں نے دشمن کے وہ تمام ہتھکنڈے بے نقاب کیے جن سے وہ ہماری صفوں میں اپنی جگہ بنا سکتا ہے۔

شوگر بینک سیریز

ابن صفی کا ایک اور شاہکار۔ اس ناول (۱۹۶۷ء) میں ابن صفی نے سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ Cryptography/ Encryption یعنی خفیہ کوڈ کے بارے میں قارئین کو آگاہی بخشی۔ زیرو لینڈ کی مزید ہوشربا ایجادات اور تھریسیا کا پھر ظہور ہوا۔ اس بار کہانی کے آغاز میں ایک ایسے بندر سے ملاقات کیجیے جو پائپ پیتا ہے، بیئر کی بوتلوں سے شغف رکھتا ہے، موسمیات کا ماہر ہے، چائے اور سلائیس کا عادی ہے۔ مگر درحقیقت اس میں ایک طاقت ور ٹرانسمٹر موجود ہے جو ایک طرف کی آوازیں دوسری طرف نشر کرتا ہے۔ اس بندر میں ایک طاقت ور بم بھی ہے جو بڑی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ دوسری چیز ان کی سے عمران کا تخت موسیقی جو تئیس تاروں پر مشتمل ہے۔ اسی تخت کی مدد سے وہ زیرو لینڈ کی Encryption کو توڑ دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس ناول میں ''ظفر الملک'' اور ''جیمسن'' کے کردار متعارف کروائے گئے۔ اس سائنس فکشن داستان میں زیرو لینڈ کی مزید سائنسی ایجادات سامنے آتی ہیں جن میں ایک جاسوس طیارہ ''ٹیکرازاز'' اہم ہے۔ یہ ناول بھی بے حد سراہا گیا۔

ایش ٹرے ہاؤس سیریز

''ایش ٹرے ہاؤس (اکتوبر ۱۹۷۱ء تا مارچ ۱۹۷۲ء)'' سیریز میں ابن صفی نے صیہونی سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ کہتے ہیں ادیب اپنے دور کی آنکھیں اور کان ہوتا ہے۔ ابن صفی پر یہ مقولہ بالکل درست ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے ستر کی دہائی سے صیہونی سازشوں کے متعلق اپنے قارئین کو خبردار کرنا شروع کیا۔ وہ ان ناولوں میں اپنے قاری پر واضح کرتے ہیں کہ دنیا کا بیشتر سرمایہ انھی صیہونیوں کے پاس ہے اور وہ مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ دنیا کے وسائل پر قابو پا کر پوری دنیا کو اپنا غلام بنائیں اس ضمن میں ان کی سب سے بڑی تنظیم فری میسن اور Illuminati مسلسل مصروف عمل ہے۔ کہانی میں اس بار ابن صفی اپنے قارئین کو یونان کے قریب جزائر کی سیر کرواتے ہیں جہاں ایک جزیرے پر اس یہودی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر واقع ہے۔ تنظیم سمگلنگ، منشیات اور جعلی کرنسی کے کاروبار کے ساتھ ساتھ عریاں فلمیں اور رسالے بنانے کے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے۔

عقابوں کے حملے سیریز

اس سیریز (اگست تا دسمبر ۱۹۷۲ء) کو اگر سنگ ہی کی واپسی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کہانی میں ابن صفی نے اپنے قارئین کو ایک بار پھر اس طرح جھنجھوڑا ہے کہ ایک لمحہ تو یقین ہی نہیں آتا کہ ابن صفی کا

تخیل کتنا اونچا اڑ سکتا ہے۔ سنگ ہی کا اصل مقصد دوست ملک کی سرحد میں عمران کے ملک کے بنے اسلحے کی کھیپ پکڑوانا ہے جس سے دونوں ممالک کے تعلقات خراب ہو جاتے۔ اس سیریز کی آخری کہانی میں ایران (گو ابن صفی نے ایران کا نام استعمال نہیں کیا) کی سیر کیجیے جہاں عمران اور سنگ ہی میں خون ریز تصادم پیش آتا ہے۔ یہ کہانی نہیں بلکہ آج کی حقیقت ہے جس میں ہمارا ایک دشمن ملک کسی اور ملک کی مدد سے ہماری سرزمین پر انتشار پھیلا رہا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کہانی ۱۹۷۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت ابن صفی نے ایسے حالات کی طرف اشارہ کر کے اپنے قارئین کو ذہنی طور پر چوکنا کیا کہ مستقبل میں انھیں کن حالات سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

کنگ چانگ

ابن صفی کی اس تخلیق (ستمبر ۱۹۷۳ء تا فروری ۱۹۷۴ء) کو اگر سائنس فکشن شہ پارہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس بار وہ اپنے قارئین کو بحر اکاہل کے دور دراز جزائر کی سیر کرواتے ہیں جو تاہیتی اور اس سے ملحقہ بہت سے جزائر جن میں سے ایک پر "پومارے پنجم" کا مقبرہ موجود ہے۔ اس مقبرے کی خاص بات یہ ہے کہ اس پر شراب کی بوتل، جسے Decanter کہا جاتا ہے، نصب ہے۔ کہانی کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس میں ابن صفی کے مخصوص تیر در تیر پلاٹ موجود ہیں۔ اس داستان میں نئی سائنسی ایجادات سے ملیے۔ اسرار انگیز، ایک ایسا تارپیڈو جو خون ریز سے بنا ہے اور اس کے اگلے حصے پر چاپ دار تاریں ہیں جن سے کشتیاں اور جہاز الٹ سکتے ہیں۔ ساحل سمندر کی حفاظت کے لیے زیر آب لہریں جن سے ٹکرانے والی شے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک جزیرے میں پائی جانے والی دھند جس سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ زیر زمین زلزلہ پیدا کرنے والے میزائل ایسی تباہی لاتے ہیں جو قدرتی آفت محسوس ہو۔ یہ کہانی بھی انسانی سرشت کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو انتقام کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں اور مغربی ممالک کی ان کوششوں کی طرف بھی نشاندہی کرتی ہے جو وہ پس ماندہ اقوام کو اپنے زیر نگیں رکھنے کے لیے کرتے ہیں اور اپنی استعداد میں ہمہ دم اضافے کی جستجو میں مصروف ہیں۔

لیڈی لاما سیریز

اس داستان (جولائی ۱۹۷۳ء تا دسمبر ۱۹۷۳ء) میں اٹلی کی سیر کیجیے۔ ابن صفی اٹلی کی جھیلوں، جنگلوں اور قصبوں کی ایسی جزئیات بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ کوئی اور ملک نہیں دیکھا البتہ دیکھیے کیسی اچھی تفصیل سے جگہوں اور علاقوں کی بالکل درست منظر کشی کر سکے۔ یہ داستان اٹلی میں ایک باطنی حکومت کے سربراہ ایڈلاوا کے بارے میں ہے جو پوری دنیا میں اسلحے کی سمگلنگ میں ملوث ہے اور عمران کے ملک میں بھی اس کے کارندے کام کر رہے ہیں۔ ایڈلاوا ایک ایسا شخص جو میک اپ کے ساتھ ساتھ آواز بدلنے کا بھی ماہر ہے اس کی اصل شکل کیا ہے وہ کون ہے کوئی نہیں جانتا۔ عمران بڑی طویل ذہنی و جسمانی مشقت کے بعد ایڈلاوا کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

تین سنکی

"درندوں کی بستی" میں شکرال اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ یہ داستان بھی چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کہانی کی ابتدا سے پہلے کی کہانی "شہباز کا بسیرا (اپریل ۱۹۵۷ء)" بھی بڑی اہم داستان ہے جس میں ابن صفی ایک صوبے میں علیحدگی پسند تحریک کے بارے میں روشنی ڈالتے ہیں۔ حالات وہی ہیں جو کسی دور میں سوات کے تھے ویسا ہی منظر نامہ جس میں ایک آدمی ریڈیو پر حکومت کے خلاف تقریریں کرتا ہے اور ریاست در ریاست کے مصداق اپنی ایک باطنی حکومت چلا رہا ہے۔ اس کہانی کے اختتام پر عمران شکرال میں داخل ہو جاتا ہے۔ شکرال کی یہ داستان صیہونیت کی غیر انسانی سازشوں کا پردہ چاک کرتی ہے جن سے وہ معصوم افراد کو اپنے سائنسی تجربات کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اس ضمن میں وہ تمام غیر یہودیوں کو جنھیں وہ گوئم کہتے ہیں، ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابن صفی نے آج سے پچاس سال پہلے بتا دیا تھا کہ صیہونی مسلمان اور عیسائی دونوں کے مشترکہ دشمن ہیں۔ اس داستان (مئی تا ستمبر ۱۹۵۷ء) میں محیر العقول تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہودی سائنس دان ایسے سیرم Serum تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جن سے انسان کے جسم پر گوریلوں کی طرح لمبے لمبے بال اُگ آتے ہیں تاہم اس کی سوچ یا ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ان گوریلوں کو یہ صیہونی سائنس دان ایک طرف تو مختلف تجربات کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور دوسری طرف وہ انھیں متمول افراد کو بیچ کر دولت کماتے ہیں۔ صیہونیت Zionism نوع انسانی کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے اس کا ادراک ابن صفی کو نصف صدی قبل ہی ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنی تحریروں میں بار بار اپنے قاری کو بھی اس کا احساس دلاتے رہے۔

جونک اور ناگن

ایک بار پھر زیرولینڈ والوں نے عمران کے ملک کو اپنا اکھاڑا بنا لیا ہے۔ یہ داستان (جون تا ستمبر ۱۹۶۷ء) نئے سائنسی تجربات پر مشتمل ہے جس میں ایک بار پھر پس ماندہ اقوام کے افراد کو تجربوں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ دھاری دار آدمی ایک مخصوص تجربے کے بعد انجانی طاقت ور ہو جاتا ہے اور اس کو جو بھی ہدایت دی جائے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا ہے۔ یہ داستان "جنگل کی شہریت" میں مکمل ہوتی ہے۔

جنگل کی شہریت

اس کہانی (مئی تا جولائی ۱۹۶۷ء) میں افریقی ملک تنزانیہ کی سیر کیجیے۔ زیرولینڈ ہر پس ماندہ ملک میں ڈیرے ڈال کر بیٹھا ہوا ہے تا کہ اسے مفت کے مزدور مل سکیں۔ یہ کہانی بھی تنزانیہ کے جنگلوں میں زیرولینڈ کی فیکٹریوں کی ہے جہاں وہ بسنے والے جنگلیوں کو ان دھاری دار آدمیوں، جنھیں زیرو امین کہا جاتا ہے، کو قابو میں رکھتے ہیں۔ اس بار تھریسیا ایسا پلاٹ ترتیب دیتی ہے کہ خود عمران پر زیرولینڈ کے ایجنٹ ہونے کا شک ہونے لگتا ہے۔ اس کے گھر سے زیرو امین کی ہلاکت خیزیاں دکھانے کے بعد بلاکو ماہی بین البراعظمی میزائلوں کے پروجیکٹ ہلاکت خیز کی تصویر ملتی ہیں۔ یہ میزائل آج Inter Continental Ballistic Missiles (ICBM) کہلاتے ہیں۔ پراجیکٹ ہلاکت خیز دراصل ایک شعاع ہے جو بہت ہی تباہ کن ہے۔ یہ نظریہ جو ابن صفی نے سن ۱۹۶۷ء میں پیش کیا تھا آج Laser Weapon System کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس میں ایک انجانی شدت کی شعاع استعمال کی جاتی ہے۔ اس کہانی میں ابن صفی نے Warfare کی ایک ایسی قسم کا ذکر کیا ہے جو اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں Smart Weapons & Gadgets کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس کہانی میں ابن صفی نے ایسے پرندوں اور جانوروں کا ذکر کیا ہے جن کو باقاعدہ آپریشن کر کے ان کی ایک آنکھ میں کیمرہ اور پیٹ میں ٹرانسمیٹر اور آتش گیر مادہ نصب کیے گئے۔ یہ پرندے، جن میں طوطے اور بندر شامل ہیں، پورے جنگل میں نگرانی کے کام آتے ہیں اور نگرانی کے علاوہ جب کسی سے بات کرتی ہو یا کسی کی آواز سنتی ہو تو بھی یہ جانور اور پرندے بڑے کارآمد ہیں۔ اس داستان میں جہاں انوکھی اور محیر العقول ایجادات سامنے آتی ہیں وہیں بین الاقوامی ریشہ دوانیاں بھی بے نقاب ہوتی ہیں کہ بڑی طاقتیں کس طرح اپنے مفاد کے لیے پس ماندہ اقوام کو استعمال کرتی ہیں۔

زیرو لینڈ کی تلاش

زیرو لینڈ کے سلسلے کا سب سے طویل سلسلہ (جولائی ۱۹۷۸ء تا مئی ۱۹۷۹ء) جو سات حصوں پر مشتمل ہے۔ اس بار کہانی بہت ہی دلچسپ، پُر پیچ اور تحیرات سے بھرپور ہے۔ ہر حصہ ایک مکمل کہانی اور تمام کہانیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی۔ اس ناول میں ابن صفی پھر ایک بار نئی سائنسی ایجادات سے اپنے قارئین کو حیران کر دیتے ہیں۔ اڑنے والی گاڑی، ایک ایسی اینٹی آب دوز جس کے اوپری حصے پر چٹانیں اگی ہوئی ہیں اور وہ عام آب دوزوں سے بے حد تیز رفتار آب دوز ہے۔ یہاں ابن صفی ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مغربی اقوام کی طرف سے جو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پس ماندہ ممالک میں کام کر رہے ہیں وہ بھی اپنے ملکی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اس کہانی میں بہت سی جہتیں ہیں جن پر بڑی طویل بحث کی جا سکتی ہے جن میں مصنوعی مریخ، خلائی سٹیشن اور انسانی چہرے والے روبوٹ شامل ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں کی دوڑ کے بعد اب امریکہ، روس اور چین خلا میں اپنے اپنے سٹیشن اور ان سے منسلک ہتھیار اور گاڑیاں وغیرہ بنا رہے ہیں۔

بے باکوں کی تلاش

"بے باکوں کی تلاش (مئی ۱۹۹۵ء)" ابن صفی کا وہ شاہکار ناول ہے جس کی کہانی نہ صرف "دھماکا" فلم میں استعمال کی گئی بلکہ اس ناول کا ایک حصہ جس میں ایک لڑکی اپنے فرضی عاشق کی طرف سے خود کو خط لکھتی ہے وحید مراد کی ایک فلم "اشارہ" میں بھی شامل کیا گیا۔ بے باکوں کی تلاش کو اپنی نوع کا منفرد ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں مزاح اور ہلکے پھلکے رومان کی چاشنی بھی ہے اور جاسوسی بھی۔ بے باکوں کی تلاش ابن صفی کی ان کہانیوں میں سے ہے جس میں انھوں نے معاشرے کی ہائی سوسائٹی کے افراد خصوصاً لڑکیوں کی نفسیات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ بھی ان کے محسوسات میں شریک ہو سکیں۔ اس ناول میں حمید کا کردار بے حد سراہا گیا اور پوری کہانی میں اس کے نفسیاتی تغیرات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا۔

خطرناک انگلیاں

یہ سلسلہ بھی تین ناولوں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانی ۱۹۷۹ء میں لکھی گئی تھی جب ہمارا ملک ایٹمی قوت نہیں بنا تھا۔ مگر ابن صفی کی نگاہ دور بین نے یہ جان لیا تھا کہ مغربی قوتیں ہر حالت میں ہمارے ایٹمی

پروگرام کی مخالفت کریں گی اور اگر ہم یہ قوت اپنے زور بازو پہ حاصل کریں گے تو پھر وہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ سلسلہ بھی اسی نظریے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔

آخری آدمی

ساری زندگی اپنے قلم اور تخیل کی طاقت سے قاری کو اپنی گرفت میں لینے والے ابن صفی کی آخری تخلیق آج بھی ان کے چاہنے والوں کے لیے ایک سربستہ راز ہے۔ یہ ناول ابن صفی کی وفات کے ڈھائی مہینے بعد اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول مکمل تھا یا نہیں یہ ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک حل نہ ہو سکا۔ بقول احمد صفی جس طرح ابن صفی کی تخلیقات پر درج ہوتا تھا کہ "مطبوعات اسرار پبلی کیشنز" اسی طرح "آخری آدمی" "وہم" کیلئے "زاسرار اسرار" کہہ سکتے ہیں۔

متفرق کتب

ابن صفی کے جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے علاوہ نو متفرق کتب اور شاعری کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ ان تخلیقات کا مختصر تعارف ذیل میں ہے:

معزز کھوپڑی

سرزمین شمال سے تعلق رکھنے والی کہانیوں کا مجموعہ جس میں کل چار کہانیاں شامل ہیں۔ تین شمال کے مختلف واقعات ہیں اور چوتھی کہانی میں خطرہ الملک اور شمسی جلوہ گر ہو کر ایک غیر ملکی جاسوس کو گرفتار کرتے ہیں۔ شمال سے تعلق رکھنے والے دو مثالی کردار ایرج اور عقرب کے ہیں۔ ایرج قوت کا سرچشمہ ہے تو عقرب عقل کا۔ دونوں مل کر ایک اکائی بناتے ہیں اور ایک دوسرے کے [illegible] ہیں۔ ان کہانیوں میں ایڈونچر اور سسپنس اپنے عروج پر ہیں۔

بلدران کی ملکہ

ایرج اور عقرب کے کارناموں پر مشتمل ایک مکمل ناول جس میں وہ شکرال کی ایک ظالم ملکہ سے دیگر قبائل کی جان چھڑاتے ہیں۔ جادو، بہادری اور تجسس سے بھرا یہ ناول ابن صفی کے تخیلات اور زور قلم کا بڑا عمدہ نمونہ ہے۔

شمال کا فتنہ

ماہنامہ نیا رخ میں قسط وار شائع ہونے والی تخلیق "شمال کا فتنہ" ابن صفی کی زندگی کی آخری تخلیق

ہے۔ شمال کی سرزمین ہمہ وقت لڑائیوں اور سازشوں کا مرکز بنی رہتی ہے۔ اس ناول کے دو کردار شیر دل اور چوہی منگا ایسے یادگار کردار ہیں کہ گویا ذہنوں سے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ شیر دل اس مہم میں شکرال کے شمالی علاقوں میں باغیوں کا قلع قمع کرتا ہے جن میں داراب سرکش نامی ایک انتہائی خطرناک اور طاقتور باغی سردار شامل ہے۔ مہم جوئی اور سنسنی سے بھرپور ناول جس کو پڑھ کر شکرال کے باسیوں کی پوری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

قابلِ اعتراض تصویر

یہ سراغ رسانی، طنزیہ اور مزاحیہ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ مختصر مگر ابن صفی کا مخصوص آہنگ لیے ہوئے ہے۔ پہلی کہانی قابلِ اعتراض تصویر کرنل فریدی اور حمید کے ایک کارنامے پر مشتمل ہے۔ ہوائی قلعے، ایک رومانی افسانہ اور سور کا بچہ محبوب مزاحیہ کہانیاں ہیں، بچی مراد نامی کہانی میں ابن صفی کا قلم طنز کے نشتر برساتا ہے۔ ساڑھے پانچ بجے اور پیش گوئی کا شکار انور اور رشیدہ کی کہانیاں ہیں۔

اب تک تھی کہاں

ماہنامہ عالمی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا ناول دراصل خواجہ نجم الدین نجمی کی روداد ہے جسے ابن صفی نے اپنا مخصوص آہنگ عطا کر کے امر بنا دیا ہے۔ یہ ناول بقول ابن صفی "خود آدمی کتنا پُراسرار ہے؟ کیسی کیسی کیفیات سے گزرتا ہے کن کن ادوار کی پرچھائیاں اس میں رینگتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے ذہنوں کو وہ کس طرح اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ کہانی ایسے سوالات پر مشتمل ہے۔ مصری اساطیر کی فضا میں یہ کہانی پروان چڑھتی ہے اور اختتام بیسویں صدی پر ہوتا ہے۔ اس میں سسپنس بھی ہے۔ رومان بھی ہے اور ڈراما بھی۔ قاری یہی محسوس کرے گا جیسے کوئی فلم دیکھ رہا ہے"۔

ڈپلومیٹ مرغ

بارہ طنزیہ اور مزاحیہ کہانیوں پر مشتمل یہ مجموعہ بڑا دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ اس پوری کتاب کی جان اگر "آبِ وفات" کو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آبِ وفات دراصل آزاد کی آبِ حیات کی پیروڈی ہے اور اس کمال کی کہ نثر میں اس پائے کی پیروڈی نہایت کم یاب ہوگی۔ یہ مجموعہ ابن صفی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو انھوں نے بطور طغرل فرغان "ماہنامہ نکہت الہ آباد" کے لیے لکھے تھے۔

شیطان صاحب

شیطان صاحب ابن صفی کے بارہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ مجموعے میں شامل کہانی ''فرار'' ابن صفی کی پہلی کہانی ہے جو بطور طغرل فرغان ماہنامہ ''نکہت'' میں شائع ہوئی اس کہانی میں طنز ومزاح اور ایک غیر مقفّی نظم قابل مطالعہ ہیں۔ یہ مجموعہ مزاح کا ایک نیا دبستان کہلائے جانے کے قابل ہے۔

پرنس چلی

ابن صفی کے قلم کا جادو پرنس چلی میں سر اٹھا کر بولا۔ پوری کہانی طنز اور مزاح سے بھرپور ہے۔ یہ کہانی دراصل ان طاقت ور گروہوں کی کہانی ہے جو مختلف طلبا تنظیموں کی صورت پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سیاست دان، بیوروکریٹ، پولیس اور با اثر افراد ان طلبا تنظیموں کو اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں نتیجتاً بہت سے طلبا سیاست کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور ان کے اثر ورسوخ میں بھی بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ طلبا تنظیموں کے ساتھ ساتھ یہ کہانی لالچ اور خاندانی چپقلشوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔

ترک دو پیازی

ویسے تو ابن صفی کی تمام تخلیقات میں طنز ومزاح کی چاشنی موجود ہے مگر کسی ایک تخلیق کو ابن صفی کے معیار کا نہ مانا جائے تو وہ ترک دو پیازی ہے۔ یہ ناول مغلیہ دور سے لے کر آج تک کے حالات پر لکھا گیا لگتا ہے۔ تو ہم پرستی، جاہ ومنصب کی خواہش، محلاتی سازشوں اور ضعیف الاعتقادی کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول اپنے کرداروں کی بدولت مزاح میں ایک اونچا مقام رکھتا ہے۔ یہ پورا ناول نہ صرف اٹھارہویں صدی کے اواخر کے مسلمانوں کے رہن سہن کو واضح کرتا ہے بلکہ افسوس ناک حد تک آج بھی ہماری وہی حالت ہے۔ جہاں ابن صفی کی دیگر تخلیقات کو نظر انداز کیا گیا وہیں اس شہ پارے کو وہ توجہ نہیں ملی جس کا یہ حق دار ہے۔

متاع قلب ونظر

ابن صفی کا شعری مجموعہ ''متاع قلب ونظر'' ان کی وفات کے پینتیس برس بعد ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ مجموعے میں ۱۷ نظمیں، ۹۹ غزلیں، تین شعروں پر مشتمل ۶ غزلیں، ۹ قطعات اور ۲۵ متفرق اشعار شامل ہیں۔ مجموعے کا سرورق ابن صفی کے بنائے گئے اسکیچ کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ اس مجموعے

میں ان کی تحریر کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ ابن صفی نے اسرار ناروی کے نام سے چھوٹی سی عمر میں شعر کہنا شروع کیے اور جلد ہی ایک منفرد اور ثقہ شاعر کے طور پر مشہور ہو گئے۔ ان کی شعری تخلیقات ان کی نثر کی طرح اپنے زمانے سے آگے کی محسوس ہوتی ہیں۔ وگرنہ شاعری کا جو رنگ اس زمانے میں عام تھا اسرار ناروی کی شاعری اس سے مختلف اسلوب اور آہنگ کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں آنے والے زمانے کے شعور کا ادراک ملتا ہے۔ شاعری اسرار ناروی کے لیے روح کا لبادہ نہیں بلکہ جسم اور روح کی ایک وحدت ہے۔ اپنی شاعری میں انھوں نے صرف خود کو ہی مخاطب نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی متوجہ کیا۔ یہ شاعری ابلاغ کی اس سطح کو چھوتی ہے جو ایک مکالمہ بن جاتی ہے شاعر کی ذات اور قاری کے درمیان مکالمہ۔

☆☆☆☆

نامکمل تصنیف

آدمی کی جڑیں

انسان کا ذہن بڑی پیچیدہ چیز ہے کس وقت کیا کر جائے کچھ نہیں پتا۔ مختلف موقعوں پر اس کا کیا ردعمل ہوگا یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ مختلف افراد ایک ہی صورت حال میں مختلف طریقوں سے پیش آتے ہیں۔ ان رویوں اور انسان کی عقل کے سائنسی مطالعے کو نفسیات کہتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں نفس کا مطالعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس مطالعے کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے جس میں قیاس، ادراک، جذبات، شخصیت، دوسرے لوگوں سے تعلقات اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے رویے کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ابن صفی کا نامکمل ناول ''آدمی کی جڑیں'' بھی دراصل پیچیدہ انسانی ذہن، نفسیات اور رویوں کی عکاسی ہے۔ یہ ناول قسط وار ماہنامہ آنچل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۵۹ء میں ہوئی، دو اقساط شائع ہوئی تھیں کہ ابن صفی شیزوفرینیا کا شکار ہو گئے اور تین سال تک کچھ بھی نہ لکھ پائے۔ گو ۱۹۶۳ء سے انھوں نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا تھا تاہم یہ ناول جہاں چھوڑا وہیں رہ گیا۔

کہانی ایک دین دار شخص جلال الدین رضی حیدر کے گھرانے کے گرد گھومتی ہے جس کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا ہارلش اور باپ کی منشا کے مطابق چلنے والا اور چھوٹا اپنی مرضی کرنے والا۔ کہانی کا مرکزی کردار بڑا بیٹا کمال ہے جو ایک شاعر بھی ہے۔ بچپن سے ہی اس پر اپنے والد کا خوف طاری تھا۔ اسی خوف سے اس کی شخصیت ایک تضاد کا مجموعہ بن گئی۔ اپنے جذبات اور خواہشات کے برعکس اسے کچھ اور کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ شادی بھی اپنے والد کی مرضی سے کرنی پڑی اور داڑھی بھی والد کی منشا کے مطابق رکھنی پڑی۔ لباس بھی مشرقی اور جب تک وہ گھر میں موجود رہتا ہے اس کی شلوار یا پاجامہ ٹخنوں سے اوپر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ والد کی موجودگی میں وہ اپنے کمرے میں بھی ایک مخصوص وقت کے بعد ہی جا سکتا تھا جس سے اس کی بیوی اور اس میں بہت فاصلے پیدا ہو گئے۔ اپنے والد کا کمال پر اتنا خوف

طاری ہے کہ وہ شاعری میں بھی انجانی سنگ موضوعات چنتا ہے۔ اس تمام کشمکش کا نتیجہ ایک انجانی پیچیدہ
شخصیت کے طور پر سامنے آیا۔ کمال کا چھوٹا بھائی ابو سعید عرف اَنّی اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی
گزارتا ہے۔ وہ ذہنی و فکری طور پر زیادہ مضبوط اور مصلحت پسند ہے۔ اس پر والد کا اتنا رعب نہیں طاری
ہوتا ہے۔ گھر سے جیب خرچ لیتا ہے مگر اپنی ذات کے لیے وہ نوکریاں بھی کرتا ہے اور تعلیم بھی حاصل کر
رہا ہے۔ کہانی میں ایک کردار کمال کے دادا کا بھی ہے جو اپنے بیٹے سے علاحدہ شہر سے دور گاؤں میں رہتا
ہے۔ ان کے علاوہ کرداروں میں شکیلہ، سطوت اور ساز وغیرہ لڑکیاں ہیں جن میں کمال دل چسپی لیتا
ہے۔ کمال کے ہم جماعت کثور نعیم، اکرم اور اس کے اساتذہ ڈاکٹر زیدی اور بجر چھندر پوری بھی اس
کہانی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس ناول کی کہانی کمال کے گرد گھومتی ہے یا دوسرے الفاظ میں اس کی ذہنی کشمکش اور اس کی
شخصیت کے اندر چھپے خوف کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی زندگی میں بہت سے خوف تھے۔ اپنے والد کا،
اپنی بیوی کا، اپنے اساتذہ کا اور سب سے بڑھ کر خود اپنے آپ کا۔ اس کہانی میں کمال اپنی تربیت کی
بدولت عجیب و غریب رویہ رکھتا ہے۔ والد کا خوف اس کی ذات پر کچھ ایسے نقش چھوڑتا ہے کہ اس کی پوری
شخصیت میں خوف اور ڈر جیسے رچ بس جاتا ہے۔ یہ کہانی انسانی نفسیات کے کئی پیچیدہ پہلوؤں کو بے
نقاب کرتی ہے جو کسی خوف کی وجہ سے اس کے لاشعور میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی کشمکش اس کے نفسی و
اعصابی امراض کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی کج رویوں کا باعث ہے۔ وہ اپنی ایک ہم جماعت لڑکی
کو بے حد پسند کرتا ہے مگر اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ اسی ہم جماعت کو شاعری کی دو کتابیں
بھی مرتب کر دیتا ہے۔ پھر اسے اپنی ایک اور ہم جماعت پسند آجاتی ہے وہ اسے بھی دل کا حال کہہ نہیں
پاتا۔ کمال کا چھوٹا بھائی اَنّی اس کی ان کیفیات کا بغور مطالعہ کرتا رہتا ہے اور گاہے بگاہے اسے سمجھاتا
بھی ہے۔ کمال کے مقابلے میں اس کا چھوٹا بھائی زیادہ پُر اعتماد اور ذہنی طور پر مضبوط ہے۔

آہستہ آہستہ کمال کے خوف اور سوچیں اس کے اندر ایک لاوے کی طرح ابلنا شروع کر دیتے
ہیں۔ ایک دن وہ اپنی بیوی کے متعلق سوچتے گھر داخل ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کی سہیلی
آئی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کی ہنسی سنتا ہے تو بے اختیار ہو کر اس کا تجسس اسے دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم
کے دروازے کے شیشے میں جھانکتا ہے۔ اس کی بیوی سامنے ہی بیٹھی ہوتی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ شاید کمال
اس کی سہیلی کو دیکھنا چاہ رہا ہے وہ اس کی شکایت اس کے والد سے کر دیتی ہے۔ اس کے والد اس کو مارنے

لگتے ہیں اور اس ذلت، ندامت اور غصے میں اس کے اندر کی کشمکش اس کے خوف پر حاوی آ جاتی ہے اور
جس طرح لاوا پہاڑ کی سطح پھاڑتا ہوا باہر نکل آتا ہے وہ بھی تمام خوف اور ڈر نکال باہر کرتا ہے اور وہ سب
کچھ کر دیتا ہے جو اس کی دبی ہوئی شخصیت کے اندر کہیں دفن تھا۔ وہ نہ صرف اپنے والد سے بدتمیزی کرتا
ہے بلکہ اپنا گھر بھی چھوڑ دیتا ہے۔ راستے میں ایک سیلون سے داڑھی کٹواتا ہے اور ڈاکٹر زیدی کے پاس
چلا جاتا ہے۔ اس کی نئی شکل یونیورسٹی میں بھی مشہور ہو جاتی ہے وہ یہ راز بھی سب کو بتا دیتا ہے کہ وہ شاعر
جس کی رومانی نظمیں سبھی کو پسند تھیں وہ کمال ہی تھا جو بن باسی کے نام سے لکھتا تھا۔ اس نئے انکشاف پر
ایک بار پھر تہلکہ مچ جاتا ہے۔ ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں کمال اپنے بارے میں یہ
تقریر کرتا ہے:

> "جب سے دنیا وجود میں آئی ہے انقلابات کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ زندگی کے ہر شعبے
> میں تغیر و تبدل کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر تبدیلی ارتقا کے سلسلے کی ایک کڑی ہے،
> کڑیاں بڑھ رہی ہیں اور کاروانِ حیات رواں دواں ہے۔ میں نے ایک بار
> نارنگی کی شاخوں پر ایک ننھے سے کیڑے کو رینگتے دیکھا تھا جو اس کی پتیوں کو
> چاٹ چاٹ کر بڑھتا رہا۔ جب وہ کافی بڑا ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک ٹہنی
> سے بے حس و حرکت لٹکا ہوا ہے۔ اس کی شکل تبدیل ہو گئی تھی۔۔۔ ایسا لگتا تھا
> جیسے ایک روئی غلاف نے اس کے پورے وجود کو ڈھانپ لیا ہو۔ روز بروز اس
> کی رنگت بھی تبدیل ہوتی رہی۔۔۔ پھر وہ سبز سے بھورا ہو گیا۔۔۔ اور ایک روز
> میں نے دیکھا کہ اسی غلاف سے ایک خوش نما تتلی برآمد ہوئی اور فضا میں چکراتی
> ہوئی لامحدود وسعتوں میں گم ہو گئی۔ بالکل اسی طرح میں بھی اپنے خول سے باہر
> آ گیا ہوں۔۔۔"

یہاں کمال اپنی پوری شخصیت کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر اپنے اس فیصلے پر قائم رہتا ہے کہ خواہ کچھ ہو
جائے وہ واپس نہیں جائے گا۔ اس کی پسندیدہ طالبہ ثروت آ کر کہتی ہے کہ دو تین روز میں اس کے کرایہ دار
جا رہے ہیں لہٰذا وہ ان کے گھر کی اوپری منزل میں بطور کرایہ دار رہ سکتا ہے۔ اس مرحلے پر اس کے والد
جو اس کے نئے روپ پر بہت غصے میں ہوتے ہیں اسے عاق کر دیتے ہیں۔ کمال اس کی پروا بھی نہیں کرتا
اور ہجر صاحب کے یہاں چلا جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات دو سینیئرز سے ہوتی ہے اور وہ ان سے تخلیق

زندگی سے روشناس کروانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔۔۔۔

یہ داستان اس جگہ آ کر بیشتہ کے لیے نامکمل رہ گئی۔ اردو ادب میں آدمی کی جڑیں ایک بالکل منفرد اور انوکھا تجربہ تھا۔ ایک انسان کی نفسیات کی مختلف واقعات اور شخصیات کے حوالے سے تشریح کا یہ پہلا پیرایہ تھا۔ ایک انسان پر بہت ہی داخلی اور خارجی محاربات اثر ڈالتی ہیں۔ ایک کامیاب انسان وہ ہے جو ان محاربات اور اپنی دبی ہوئی خواہشوں کو اس طرح منظم کرے کہ اس کی شخصیت میں کوئی منفی چیز داخل نہ ہو۔ اس ضمن میں ایک شخص کے اردگرد کا ماحول، داخلی اور خارجی محرکات اور اس کے رجحانات؛ سب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین اپنے بچوں کی تربیت کچھ اس انداز میں کریں کہ ان کا خود پر اعتماد بڑھے اور وہ اس یقین سے ہر کام کریں کہ میرے والدین میری رہنمائی کریں گے۔ یہ انسانی سرشت ہے کہ آپ انسان کو جس چیز سے منع کریں گے وہ وہی کام ضرور کرے گا تو بے جا پابندیوں کی بجائے اگر بچوں کو ہر کام کے فوائد اور نقصانات سمجھا دیے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ کمال کی ذہنی گھٹن اور غیر متوازن سوچ کا باعث یہی تلخیاں تھیں جس سے ایک بالکل نئی شخصیت ابھری جو پرانے کمال سے بالکل الٹ تھی۔ آدمی کی جڑیں ایک ادبی شہ پارہ ہے اور اس کا عمیق مطالعہ یہ ثابت کرے گا کہ ابن صفی سے پہلے اور بعد میں انسانی نفسیات کی اتنی بہترین عکاسی کسی نے نہیں کی۔

☆☆☆☆

مجموعی جائزہ۔ فکروفن

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کی تصویر کشی ادب ہے اور ادیب زندگی کے سارے حقائق کی ترجمانی کا کام کرتا ہے۔ تاہم اگر اس تصویر کشی میں ایک مقصد بھی شامل کر لیا جائے تو اس تصویر میں کچھ ایسے رنگ پیدا ہو جاتے ہیں جو دیکھنے والوں کو اور بھلے لگتے ہیں۔ ابن صفی کے خاندانی پس منظر نے ان کی علمی و فکری تربیت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بچپن سے مطالعے کی عادت نے ان کے قلم کو وہ پختگی عطا کی جو کم سنی میں ہی تسلیم کر لی گئی۔ "طلسم ہوشربا" اردو زبان میں مستقل سائنس فکشن کا نقطہ آغاز ہے۔ ساتویں جلدوں میں ایسے عجائبات کا ذکر ہے جنھیں غور سے دیکھیں تو وہ جدید دور کی ایجادات سے کسی طور کم نہیں۔ عمر و عیار کی زنبیل دیکھ لیں ایک چھوٹا سا تھیلا ہے جس میں جو چیز ڈالیں وہ بھرتا ہی نہیں۔ چادر سلیمانی ایک ایسی چادر جسے اوڑھیں تو نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ روغن عیاری ایک ایسا مادہ جسے چہرے پر ملیں تو شکل تبدیل ہو جائے۔ اڑن کھٹولے، قالین اور نہ جانے کیا کیا۔ اس داستان کے مطالعے نے ابن صفی کے ذہن پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ بچپن میں رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں نے انھیں اسیر رکھا۔ اردو اور انگریزی زبان کے کلاسیک کے ساتھ ساتھ انھیں یونانی اور مصری اساطیر پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ اس مطالعے نے ان کے ذہن پر ایسا تسلط جمایا کہ ان کی تخلیقات میں طلسم ہوشربا جیسی چاشنی اور رائیڈر ہیگرڈ اور اساطیر جیسی حرارت پیدا ہو گئی۔ ابن صفی کو لکھنے کی صلاحیت گویا قدرت سے ملی تھی کہ جس صنف میں لکھا اس میں نئے معیار قائم کیے۔ پہلی کہانی رومانوی انداز میں لکھی، شاعری کی تو بہت جلد الہ آباد میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ طنز اور مزاح تو گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ طغرل فرغان ہو یا سنکی سولجر ایک زمانہ ان کے قلم کی کاٹ کا شیدائی تھا۔ جاسوسی ناول لکھے تو ایک نیا دبستان شروع کیا۔ فلم لکھی تو اس میں اپنے عہد سے آگے کے تجربات کیے۔ خاکے لکھے تو ایسے رنگ بکھیرے کہ ہم ان شخصیات کو اپنے ارد گرد چلتا پھرتا محسوس کر سکتے ہیں۔

ابن صفی کا شمار ایسے محرّروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اصناف ادب میں نئی راہیں نکالیں۔ اگر ابن
صفی کی تحریروں کی درجہ بندی کی جائے تو انھیں جاسوسی ناول، افسانہ، سفر نامہ، سائنس فکشن اور مزاحیہ یوں
میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے ابن صفی کی تخلیقات اتنی متنوع ہیں کہ بقول ابن
صفی "حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو"۔ تاہم
ابن صفی کی تمام تر تخلیقات صرف ایک محور کے گرد گھومتی ہیں اور وہ ہے قانون کا احترام۔ ان کی کتب سے
قاری کا ذہن کوئی منفی اثر قبول نہیں کرتا بلکہ اس میں قانون کی اہمیت اور اس کی پیروی کرنے کی خواہش
ابھرتی ہے۔ سنجیدہ مزاج فریدی ہوں یا حماقت پسند عمران، مقصد دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ قانون کا بول
بالا کرنا اور مجرم خواہ وہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو اسے قانون کے دائرے میں لانا۔ یہ ابن صفی کا ایسا کارنامہ
ہے جو ان کی تمام دیگر خدمات سے بڑھ کر ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء میں اپنے قارئین کی جو فکری اور ذہنی
تربیت شروع کی اس کا بظاہر اختتام ان کی وفات پر ہوا مگر ابن صفی کی فکر اور فلسفے کا سرچشمہ آج بھی جاری
ہے۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ابن صفی کے قارئین بلند ذہنی سطح IQ کے حامل ہوتے تھے اور ان میں
قانون کے احترام کا جذبہ دیگر شہریوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا تھا۔ ابن صفی نے سینکڑوں کہانیوں میں
انتہائی پیچیدہ پلاٹ پیش کیے مگر آخرکار جیت ہمیشہ قانون ہی کی ہوئی خواہ اس کے لیے فریدی کو کسی بھی
حد تک جانا پڑے اور عمران کو تمام رشتوں کو بالائے طاق رکھنا پڑا۔ حیرت انگیز طور پر ان کی ہر
تحریر، "پیشرس" یہاں تک کہ انٹرویوز میں بھی انھوں نے ایک ہی بات لکھی اور کہی کہ وہ تھکے ہارے
ذہنوں کو تفریح بھی فراہم کرتے ہیں اور انھیں قانون کا احترام بھی سکھاتے ہیں۔ عصری منظرنامے میں
ابن صفی کے ایک اقتباس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر ان کی یہ تجویز ۶۰ کی دہائی میں مان لی جاتی تو
آج ہمارا معاشرہ مہذب اور قانون پسند ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ جاسوسی ناول کی راہ میں
> نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں
> اور انھیں قانون کا احترام بھی سکھاتا ہوں۔ لیکن میری دانست میں محض جاسوسی
> ناولوں کا پھیلاؤ اس مشن کی کامیابی کے لیے ناکافی ہے۔ کچھ تو ذہن کی تعلیم کا
> انتظام عوامی پیمانے پر ہونا چاہیے۔ ہمارے ماہرین تعلیم نے ابھی تک اس پر
> دھیان نہیں دیا حالاں کہ یہ بے حد ضروری ہے۔ ایسا نصاب وضع کیا جانا چاہیے

کہ ابتدائی مدارس سے ہی قانون کی تعلیم شروع کی جا سکے۔ جب قانون سے
لاعلمی قانون شکنی پر سزا سے نہیں بچا سکتی تو پھر یہ ہر آدمی کا حق ٹھہرتا ہے کہ اسے
نچلی سطح پر قوانین سے آگاہی حاصل کرنے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ کیا اس
مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جا سکے گا؟" [۱]

کسی بھی کہانی یا ناول کی زبان اگر مشکل اور دقیق ہوگی تو قاری کو اسے سمجھنے میں دقت ہوگی۔ ایک کہانی میں استعمال ہونے والی زبان سادہ اور رواں ہونی چاہیے۔ اگر، کالموں میں علاقائی بولی ٹھولی، محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال وغیرہ کا استعمال ہو تو یہ سونے پہ سہاگے کا کام ہوتا ہے۔ کہانی کی زبان موضوع، مواد اور کردار کے ساتھ ساتھ قاری کی ذہنی سطح کے مطابق ہونی چاہیے۔ زبان جتنی موثر ہوگی، داستان بھی اتنی ہی موثر ہوگی۔ ابن صفی کو اپنی بات قاری کے دل تک پہنچانا آتی تھی اور انھیں ناول نگاری کے تمام لوازمات پر عبور تھا۔ کون سی بات قاری سے کس وقت کہنا ہوگی، کون سی چھپا کر رکھنا ہوگی اور صرف آخری سطر میں ہی کھول دینا ہوگی، وہ تمام مقامات بڑی کامیابی سے طے کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے قاری اکثر اوقات کوشش کرتے تھے کہ ناول ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے انجام کا اندازہ ہو جائے مگر ابن صفی اس ذہنی شطرنج کے کھیل میں قاری کے اندازوں کو مات دے دیتے تھے۔ ابن صفی اپنے ناولوں میں کسی خیالی معاشرے کی عکاسی نہیں کرتے تھے وہ تو بس روزمرہ زندگی کے حقائق دکھایا کرتے تھے۔ ابن صفی زبان و بیان کے الجھاوے دے دے کر زندگی سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس ضمن میں سب سے زیادہ معاون معیاری اور آسان فہم زبان کا استعمال ہے۔ ان کی اس خوبی کے قائل تو اہم نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری بھی تھے کہ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں بڑی معیاری زبان استعمال کی۔ ابن صفی خود کہتے تھے:

"مجھ سے کوئی سلیم جعفری (ایک وسیع النظر صحافی اور با صلاحیت ٹی وی آرٹسٹ) یہ نہ کہتا کہ صفی صاحب اردو میری مادری زبان نہیں ہے، لیکن آپ جو با محاورہ اردو مجھ سے سن رہے ہیں، آپ ہی کی کتب کے مطالعے کی رہینِ منت ہے، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد سے میرے پڑھنے والے مجھے ایسے ہی حوصلہ افزا خطوط بھی لکھتے رہتے ہیں۔" [۲]

ابن صفی کی تحریر میں بڑی روانی، سادگی اور سلاست تھی۔ ان کی نثر میں ایک عجیب سی شائستگی تھی۔

انھوں نے ناول نگاری پر بھرپور توجہ دی اور اس ضمن میں بڑی عام فہم اور سادہ زبان استعمال کی جو اوسط درجے کے قاری کی سمجھ میں آجائے۔ یہی ان کے فن کی معراج تھی کہ ایسے طبقے کے لیے لکھا جس کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور جو عام فہم زبان سمجھتا تھا۔ اگر ابن صفی بھی اس دور کے طریقہ راسخ کے مطابق مشکل اور جناتی زبان لکھتے تو وہ اتنے مقبول نہ ہوتے جتنے آج ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ناول نگاری کے باب میں یہ چیز دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان کے کرداروں کے اکثر مکالمے چست اور برجستہ تھے اور یہ صرف کرداروں کی بلکہ قاری کی ذہنی سطح کے مطابق تھے اور ایسی زبان میں تھے جو آسانی سے سب کی سمجھ میں آجائے۔ ابن صفی کے ناول کے کرداروں کی داخلی و خارجی شخصیت اور ان کی نفسیات کے عکاس تھے۔ یہی ناول کے موزوں و مناسب اور فطری و حقیقی سمجھے گئے جنھوں نے فنی و لسانی دونوں پہلوؤں سے ابن صفی کی تخلیقات کو دوام بخشا۔

ابن صفی کی ایک اور خصوصیت جو انھیں دیگر لکھاریوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے جامعیت۔ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ عموماً یہ خوبی ریڈیو، ٹی وی یا فلم نگاروں میں ہوتی ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پہلو دکھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ابن صفی کا ایک مکمل ناول ایک سو صفحات میں ختم ہو جاتا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کتاب اگر ضخیم ہوگی تو قاری کی جیب پر بار ہوگا۔ اسی لیے وہ کہانی محدود صفحات میں مکمل کر لیتے تھے۔ شعلوں کے سیریز "جنگ" "پہلا شعلہ" "دوسرا شعلہ" والے سلسلے سے انھوں نے قسط وار ناول لکھے جو بے حد پسند کیے گئے اس کے بعد تو پھر تین، چار، پانچ اور سب سے طویل سلسلہ "زیرولینڈ کی تلاش" کا تھا جو سات حصوں پر مشتمل تھا۔ ابن صفی اپنے قاری کا بڑا خیال رکھتے تھے کبھی ناول کی قیمت بھی بڑھانی ہو تو مہینوں پہلے اعلان کرتے تھے اور بہ حالت مجبوری قیمت میں اضافہ کرتے تھے۔ اس قاری دوستی نے اردو ادب میں بڑے جامع اور خوبصورت شہ پارے تخلیق کروائے۔ ایک سو صفحوں میں تمام کردار، مقامات، کہانی، داستان اپنی پوری آب و تاب سے نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اختصار ان کی تحریر میں ایک نیا ذائقہ پیدا کرتا ہے جو پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتا ہے۔ ابن صفی کی اس اختصار پسندی میں جزئیات نگاری ایک اہم عنصر تھی۔ ابن صفی کی جزئیات نگاری نہ اتنی طویل تھی کہ کہانی میں بوجھل پن کا احساس ہو اور نہ اتنی مختصر کہ ناول کی مخصوص فضا بھی نمایاں نہ ہو سکے۔ جزئیات نگاری کے اس کمال سے ان کی تحریر میں جہاں جامعیت اور اختصار پیدا ہوا وہیں ان کی تحریر فنی طور پر بھی سنورتی اور نکھرتی چلی گئی۔

کردار نگاری کسی بھی ناول میں بڑا اہم جزو ہے۔ کیوں کہ کہانی کا براہ راست تعلق انسانی زندگی سے ہے اور انسانی زندگی کے کسی گوشے یا کسی پہلو کو کہانی میں کرداروں کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے اس لیے کردار نگاری مقصد نہیں ذریعہ ہے۔ کہانی میں کردار کے سہارے ہی قصہ آگے بڑھتا ہے اور انجام کو پہنچتا ہے۔ بعض کردار مثالی ہوتے ہیں یعنی وہ شروع سے آخر تک نیک ہوتے ہیں یا بد ہوتے ہیں اور ایسے کردار فنی اعتبار سے کم زور اور معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ بعض کردار پیچیدہ ہوتے ہیں یعنی انسان کی طرح ان میں بھی خیر و شر کے پہلو ہوتے ہیں اور ان میں مختلف طرح کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ایسے کردار فنی اعتبار سے مستحسن تسلیم کیے جاتے ہیں۔ کردار جتنے فطری اور حقیقی ہوں گے، وہ اتنا ہی قاری کے ذہن پر اپنا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوں گے۔ ایسی کردار نگاری کو فن کا عمدہ نمونہ مانا جاتا ہے۔ کردار بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں، جیسے تخیلی کردار، علامتی کردار اور تمثیلی کردار۔ بہتر کردار وہ ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور اس کے دل میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ جائے۔ ابن صفی کو کردار نگاری پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ابن صفی کے کردار صرف کردار نہیں رہتے بلکہ وہ قاری کو اپنے ارد گرد چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ابن صفی کو دیگر تمام جاسوسی ناول نگاروں پر ایک سبقت حاصل ہے یہاں تک کہ انگریزی زبان کے لکھاریوں پر بھی برتری حاصل ہے کہ ہر جاسوسی ناول نگار نے دو، تین یا چار کردار تخلیق کیے۔ ابن صفی نے فریدی سیریز میں دس سے زائد مستقل کردار اور سینکڑوں غیر مستقل کردار تخلیق کیے۔ اسی طرح عمران سیریز میں بھی انھوں نے سینکڑوں مستقل اور غیر مستقل کردار تخلیق کیے۔ ان کے دو مشہور کرداروں فریدی اور عمران کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو بڑی دل چسپ صورت نظر آتی ہے۔ فریدی کی تخلیق الہ آباد میں ہوئی لہٰذا وہ ایک بٹے ہوئے ماحول کی پیداوار ہے جس میں اس کا محکمہ اس کی ریاست اور اس کی ترتیب کردہ بلیک فورس شامل ہے۔ عمران کا کردار پاکستان آ کر تخلیق ہوا لہٰذا یہ کردار آہستہ آہستہ منظم ہوا۔ اس نے سیکرٹ سروس کا محکمہ ترتیب دیا، دھیرے دھیرے سے منظم کیا۔ والد نے گھر سے بے دخل کیا تو دوست کے فلیٹ پر قبضہ جما لیا۔ یہ حالات قیام پاکستان کے فوراً بعد کے زمانے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی تخلیق میں ذہنی حقائق کو مدنظر رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے کردار اپنی مٹی سے جڑے ہوتے ہیں۔ وہ لافانی یا غیر انسانی نہیں ہوتے۔ ان کی اچھائیاں اور برائیاں انھیں ایک مکمل انسان بناتی ہیں کوئی مثالی کردار نہیں۔ مثال کے طور پر جوزف اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ ہے، وہ عموماً نشے میں ڈوبا رہتا ہے مگر کام کے وقت شکاری کتے

کی سی پھرتی رکھتا ہے۔ صفدر انتہائی بہادر، حاضر دماغ اور اپنے جذبات پر قابو رکھنے والا ہے۔ عمران کو لیجیے! وہ انتہائی شاطر ہے مگر وہ بھی غلطیاں کرتا ہے اور ایک دو بار اغوا بھی ہوا ہے۔ فریدی جیسا ہارڈ سٹون بھی چوٹ کھاتا ہے اور کئی بار مجرموں کے ہتھے بھی چڑھ جاتا ہے۔ سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر بھی مجرم تباہ کر سکتے ہیں۔ غرض ابن صفی کے تمام کردار عام انسانوں کی سی خصوصیت رکھتے ہیں وہ جذبات بھی رکھتے ہیں، اور اگر کارنامے انجام دیتے ہیں تو انھیں چوٹ بھی ہو جاتی ہے۔ غرض وہ کسی Super Hero کی طرح غیر مرئی ہیرو نہیں بلکہ ہمارے ارد گرد رہنے والے عام انسان ہیں۔

منظر نگاری سے کہانی میں کئی طرح کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جیسے دل کشی، سحر کاری، واقعہ کا موثر ہونا اور اس کے پس منظر کا نمایاں ہونا وغیرہ۔ اس لیے کہانی میں منظر نگاری کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ وہ جس طرح ایک کردار میں جان ڈال دیا کرتے تھے اسی طرح منظر بھی ایسا تخلیق کرتے کہ وہ ایک تصویر کی طرح قاری کے سامنے آ جاتا۔ ابن صفی کسی بھی منظر کی منظر کشی ایسی کرتے تھے کہ اس میں نہ بے جا طوالت تھی، نہ غیر معمولی اختصار۔ ان کی منظر نگاری کہانی کی فضا اور بنیادی خیال کو ابھارنے اور کہانی کو موثر بنانے میں ان کے کرداروں کی معاون تھی۔ نیکم گڑھ کے پہاڑی سلسلے ہوں یا سرداگڑھ کے جنگلات ہوں یا تاہیتی، آئیمزن کا جنگل ہو یا ڈلی کی کوئی جھیل ہر منظر اپنے اندر بہت سے رنگ رکھتا ہے کہیں یہ رنگ بہت گہرے ہو جاتے ہیں اور کہیں یہ مدھم مگر قاری اس منظر سے اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے جس طرح وہ خود ان مقامات کی سیر کر رہا ہو۔ یہ خیالی شہر ہوں یا ہوٹل، کلب ہوں یا تفریح گاہیں، ہر منظر اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ ابھر کر واضح ہو جاتا ہے۔ ابن صفی نے اپنے قاری کو بہت سے ممالک کی سیر کروائی ان ممالک میں امریکہ، ڈلی، برطانیہ، ایران، تاہیتی، شکرال (اسے ہم افغانستان بھی سمجھ سکتے ہیں)، ملکوا ڈور، برازیل، یونان اور مصر شامل ہیں۔ ان تمام ممالک کا رہن سہن اور تہذیب اپنی تمام تر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ یہ سارے ہجوم کا منظر ہو یا برازیل میں بولی جانے والی زبان، وادی شرجیل کے بیر سے ہوں یا چین میں اسمگلنگ کی شہزادی کی لاش، ابن صفی نے اپنی ذہنی آوارگیوں میں اپنے قاری کو بھی شریک کیا۔ مزے دار بات یہ ہے کہ ابن صفی نے صرف دو ملک دیکھے تھے ایک ہندوستان اور دوسرا پاکستان، مگر ان کے قلم نے ان ممالک کے وہ وہ رنگ دکھائے کہ دور دراز قصبوں کی تفصیل بھی بیان کی گئی۔ منظر پہاڑی علاقے کا ہو یا صحرائی، جھیل ہو یا سمندر، جزیرہ ہو یا میدان، جنگل ہو یا بستی سب کا ماحول من و عن بیان کرنا ابن صفی کا ایسا اعجاز تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اقبال نے کیا خوب کہا تھا کہ "عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں" آج کا معاشرہ اس مصرعے کی مکمل تعبیر ہے جس میں ایسی سائنسی ایجادات نظر آتی ہیں کہ نصف صدی قبل جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ بلکہ صرف تیس برس پہلے کا انسان اگر موجودہ معاشرہ دیکھ لے تو اس کا حال بھی اصحاب کہف جیسا ہو۔ Touch Panel سے کریڈٹ کارڈز اور سیٹلائٹس تحقیق سے مریخ پر زندگی کی تلاش ہو یا سمارٹ ڈیوائسز، آج ہماری زندگی ان آلات اور انٹرنیٹ کے بغیر ادھوری ہے۔ ۵۰ کی دہائی سے ابن صفی نے جہاں قانون کے احترام، اعتدال پسندی، رواداری اور زندہ دلی کو فروغ دینے کی کوششیں شروع کیں وہیں انھوں نے سائنسی ایجادات سے بھی اپنے قارئین کو روشناس کروایا۔ ان کے ناولوں میں پیش کردہ ایجادات کی فہرست ہی کئی صفحات پر مشتمل ہوگی۔ انھوں نے سائنس کی کون سی جہت ہوگی جس کو اپنے ناولوں میں نہیں متعارف کروایا۔ جدید سائنسی ہتھیار، میزائل، اسلحہ آلات، خفیہ کوڈ Encryption، پرندوں اور جانوروں میں کیمرے اور ٹرانسمیٹر نصب کرنا، بغیر تاروں کے ٹیلی ویژن، مصنوعی دھند، روبوٹ، اڑن طشتریاں، لیزر LASER شعاعیں، ذہن پر مختلف اثرات ڈالنے والے سیرم Serums، خلائی سیارے اور مراکز یہ وہ ایجادات ہیں جن سے ان کے قارئین کی شناسائی آج سے نصف صدی قبل ہی ہو گئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ان کے تحریر کردہ ہتھیار، میزائل اور Cryptography آج پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ کچھ تصورات کہ جب وہ بیان کیے گئے صرف تصورات تھے مگر آج وہ استعمال میں ہیں۔ انھوں نے سائنسی طور پر بے حد ترقی یافتہ تنظیم زیرولینڈ کا ذکر کیا تھا جو Space Warfare میں بھی بہت آگے تھے۔ خلا سے زمین پر مار کرنے والے میزائل اور سیاروں کی تباہی کی استعداد رکھنے والی زیرولینڈ تنظیم نے نہ صرف مصنوعی مریخ بنایا بلکہ وہ ایسے ہتھیار استعمال کرتے تھے جن کو آج Fifth Generation Warfare کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں استعمال ہونے والے ڈرونز Drones یعنی بغیر پائلٹ کے جہاز جن کی مدد سے انتہائی اونچائی سے نہ صرف فضائی نگرانی ہو سکتی ہے بلکہ میزائل بھی داغا جا سکتا ہے ان کا تصور وہی ہے جو زیرولینڈ کے تیار کردہ [illegible] کا تھا۔ اڑن طشتریاں آج بھی سائنسی معمہ بنی ہوئی ہیں اور انھیں Unidentified Flying Object (UFO) کہا جاتا ہے ابن صفی کے ناولوں میں [illegible] کی شکل میں پیش ہوئی اور انھوں نے ساٹھ سال قبل بتا دیا تھا کہ یہ UFO نہیں بلکہ مغربی طاقتوں کے زیر استعمال جہاز ہیں جنھیں وہ مناسب وقت پر سامنے لے کر آئیں گے۔ آج خفیہ نگاری یا Cryptography کے

بغیر کوئی کمپیوٹر یا موبائل فون پر پروگرام ممکن نہیں۔ اس کا استعمال محفوظ انٹرنیٹ کی ضمانت ہے۔ ابن صفی نے اس تکنیک کا اپنے ناولوں میں مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ کیمیاوی ہتھیار جن کی بدولت عراق پر قبضہ کیا گیا پہلے پہل ان کے ناولوں میں ذکر ہوا۔ پرندوں پر تجربات اور کیمرے وغیرہ نصب کرنا بھی ایک محیر العقول واقعہ ہے کہ آج ایسے کئی روبوٹ جاسوس جن میں جاسوسی کرنے والے کیڑے مکوڑے شامل ہیں جو بہت چھوٹے سائز میں بنائے جاتے ہیں اور ان سے نگرانی اور جاسوسی کا کام لیا جاتا ہے۔ وہ انسانوں کے جسم سے ایک طاقت اور درد دینے والی مشین بھی بجائے خود ایک کارنامہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ خود کو غائب کرنے کی صلاحیت رکھنے والے لیزر اسمگلر بھی خاصے کی چیز ہیں جن کو پہلی بار ۱۹۹۶ء میں فلم Mission Impossible میں دکھایا گیا تھا۔ ابن صفی نے مصری علاقے کے کتب اہرام طیبین میں ایک پہاڑ میں موجود آندھی پیدا کرنے والی مشین کی صورت اور بعد ازاں زلزلے کے سفر میں ایک ایسا تصور دیا جسے ہم آسان الفاظ میں موسمی تبدیلیوں پر قابو پانا کہہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں حیران کن بات یہ ہے کہ امریکہ نے اس موضوع پر تحقیق کے لیے ۱۹۹۳ء میں High Frequency (HAARP) Active Auroral Research Program کا ادارہ قائم کیا۔ پہلی ایٹمی آبدوز جس میں ایٹمی قوت سے چلنے والا پاور پلانٹ لگا ۱۹۵۴ء میں بنی اور اس کا نام USS Nautilus تھا اس کی رفتار 14 Knots تھی۔ ابن صفی نے "پیاسا سمندر" میں اس سے بھی تیز رفتار اور بڑی آبدوز کا تصور دیا جو بعد میں Ohio Class Submarines کی صورت میں سامنے آیا۔ قارئین کی معلومات کے لیے Ohio آج تک کا تخلیق کردہ سب سے مہلک ہتھیار ہے۔ صرف ایک آبدوز ایسے چوبیس میزائل رکھتی ہے جو بیک وقت ۲۴ شہر زمین کے نقشے سے مٹا دیں۔ ابن صفی کو سمندر کی گہرائیوں اور اس کی اہمیت کا بھی اندازہ تھا۔ انھوں نے واضح کیا کہ سمندری ترقی یافتہ ملکوں اور قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ آج کی مسلمہ طاقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ اسی دم سے پوری دنیا پر حکمران ہے کہ ہر سمندر تک اس کی رسائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر اہم جگہ جس میں بحرین، جبوتی، جاپان وغیرہ میں اس کے بحری اڈے ہیں۔ چنگیلا غبار میں انھوں نے جس غبار کا ذکر کیا ہے وہ آج Multi Ammunition Softkill System کے نام سے جانا جاتا ہے اور کسی بھی بحری اور ہوائی جنگی جہاز کی حفاظت کا ضامن ہے۔ ابن صفی کی تحریروں میں چھپا ایک پیغام جس کی آج ہم سب کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے اتحاد۔ غیر ملکی سازشوں، بیرونی طاقتوں کے آلہ کاروں اور صیہونی ریشہ دوانیوں کے خلاف اتحاد۔ ابن صفی وہ پہلے

تھاری تھے جنھوں نے ۵۰ء کی دہائی سے پہلے کمیونسٹوں اور بعد ازاں صیہونی سازشوں سے اپنے قارئین کو خبردار کیا۔ انھوں نے بارہا مایوسی پھیلانے والوں اور مادر پدر آزاد معاشرے کے خواہاں سازشیوں کو اس طرح بے نقاب کیا کہ ان کا فتنہ زیادہ سر نہ اٹھا سکا۔ ۶۰ء کی دہائی میں انھوں نے انٹش ٹرے، باؤز اور تین تکی جیسے سلسلوں میں صیہونیت Zionism کے ناسور سے اپنے قارئین کو آگاہ کیا۔

صیہونیت ایک ایسی ذہنی سوچ کا نام ہے جس میں ایک انسان دیگر تمام انسانوں کو خود سے حقیر سمجھتا ہے اور اپنی فرضی برتری قائم رکھنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک گر سکتا ہے۔ انھوں نے صیہونیت کی بھی مخصوص ذہنیت عیاں کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اچھا ادیب اپنے عہد سے آگے نکل کر سوچتا ہے اور ابن صفی کی بھی سوچ آج کے قارئین کو بھی حیران کر دینے پر قادر ہے۔ ان کے بہت سے ناول آج بھی وہی معنوی اور حقیقی مقصد رکھتے ہیں جو اس وقت رکھتے تھے۔

ابن صفی کو فلسفے اور نفسیات پر عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے قارئین کی جس طرح نفسیاتی تربیت کرتے تھے وہ قابل تحسین ہے۔ ان کے ناولوں میں جا بجا فلسفیوں اور ان کے نظائر پر بڑی دلچسپ، مدلل اور پر مزاح بحث ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ عمران کے پہلے ناول میں وہ مشہور فلسفی ینگ کے نام کے اصل ہجے بھی عمران کے منہ سے کہلواتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں فلسفے پر سب سے زیادہ مزے دار بحث شعلوں کے بیچ میں ہوئی جس میں وہ فلسفے کو بھنگ قرار دیتے ہیں۔ ابن صفی کی تمام تخلیقات میں انسانی نفسیات کو بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ وہ ایک کردار کی شخصیت کی ایسی نفسیاتی تحلیل کرتے ہیں کہ اس کی پوری شخصیت قاری کے سامنے آجاتی ہے اور وہ پوری طرح اس کردار سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اور پھر قاری اسی کردار کے ساتھ ساتھ کہانی کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کے ہیرو بھی انسانی نفسیات کی مدد سے کئی کیس حل کر لیتے ہیں۔ ایک ناول میں پورا کیس صرف ایک لڑکی کی یادداشت کھنگال کر حل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مجرم کو صرف نفسیاتی پہلو سے تمام جرائم سے توبہ کروا دی جاتی ہے۔ اور قاسم اور حمید تو خود اس بات کا معترف ہے کہ فریدی نے ایسے نفسیاتی طریقے اختیار کیے کہ اس کی شراب نوشی اور دیگر علائق سے جان چھڑوا دی۔ قاسم کو قابو میں لانا ہو یا جوزف کو فریدی و عمران بھی آزمودہ نسخوں سے انھیں قابو میں لاتے ہیں۔ عمران اس معاملے میں انسانی نفسیات کے تمام پہلوؤں کا بخوبی فائدہ اٹھاتا ہے جولیا ہو یا ثریا، صفدر ہو یا سیکرٹ سروس کے ممبران وہ ان سے اس خوبی سے پیش آتا ہے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عمران کی مرضی کے مطابق چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ابن صفی کا سب

اہم کارنامہ ان کا نفسیاتی ناول "آدمی کی جڑیں" ہے جس میں ایک ایسا تجربہ کیا گیا ہے کہ ہم سب کو اس ناول کا ایک بار ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ ابن صفی نے اپنے قارئین کی ہر زاویے سے تربیت کی، ذہنی، سائنسی، فکری اور نفسیاتی۔ اس ناول میں انھوں نے انسانی نفسیات کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جس سے معاشرے میں غیر متوازن سوچ اور شخصیت رکھنے والے افراد پیدا ہوتے رہیں گے۔ آج Child Psychology باقاعدہ ایک باقاعدہ مضمون ہے جو ترقی یافتہ معاشروں میں والدین کو پڑھایا جاتا ہے مگر ابن صفی نے ۱۹۵۹ء میں یہ ناول لکھ کر اس اہم مضمون کی پہلی اینٹ رکھ دی تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ابن صفی کی تحاریر میں موجود پیغام کو سمجھ کر ایسے قدم اٹھائے جائیں جن سے نفسیاتی طور پر مضبوط، اعتدال پسند، زندہ دل اور قانون کا احترام کرنے والا معاشرہ قائم کیا جا سکے۔

مزاح کا سرچشمہ خوش طبعی ہوتا ہے۔ یہ خوش کلامی اور خوش گفتاری میں پھوٹنے والے چشموں کی طرح رواں دواں ہوتا ہے۔ خوش کن باتیں، بیان میں حلاوت یا زبان میں لچک اس کے منبع ہیں۔ سمجھ بوجھ، فہم و ذکا، احساس دل، احتساب اور سلاست اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ طنز، مزاح کی باقاعدہ صنف نہیں صفت ہے۔ یہ انگریزی کے لفظ Irony کا اردو مترادف ہے۔ طنز ایک طرح بے دردانہ تنقید ہے جسے عموماً جراحی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ عام تنقید میں توازن ہوتا ہے جب کہ طنز میں اعتدال قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے چاروں جو بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں نظر آتی ہیں ان پر برملا اظہار خیال کرنا طنز ہے۔ ادب میں اس کی اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی بھی گوارا کر لی جاتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے وار اوچھا بھی پڑ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ طنز کو عمل جراحی سے تشبیہ دی گئی ہے اگر عمل پورا نہ ہوا تو عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ طنز کے لیے پختہ شعور اور تعلیم بہت ضروری ہے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ طنز نگار کو زبان و بیان پر کامل دسترس ہو۔ طنز کا محرک اصلاح کا جذبہ ہے۔ گہرائی، تیزی، اور تلخی طنز کے تین عناصر اور اس کی روح ہیں۔ بعض اوقات اس میں ایسی سنجیدگی ہوتی ہے کہ مزاح کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا اسے خوش گوار اور قابل قبول بنانے کے لیے اس میں ادبی حسن اور ظرافت کی آمیزش ضروری خیال کی گئی ہے۔ مزاح ہو یا طنز، ابن صفی نے دونوں اصناف میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کے اثرات مٹائے نہیں مٹتے۔ انھوں نے اس کمال کے شہ پارے تخلیق کیے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی تحریر کردہ "تزک دو پیازی" اردو ادب میں مزاح نگاری کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ مزاح پر ان کی گرفت کا ادراک ہمیں ان کی کتب

"ڈپلومیٹ مرغ" اور "پرنس چلی" پڑھ کر ہوتا ہے۔ ان کی کتب میں موجود شگفتہ جملے اور طنز کی کاٹ انھیں مزاح نگاروں کی اس صف میں شامل کرتے ہیں جہاں تک پہنچنا بہت سوں کو نصیب نہیں۔ شگفتگی کا یہ رنگ ان کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں بھی بے حد نمایاں ہے خصوصاً علی عمران کی زبان اور افعال دونوں سے اکثر شگوفے پھوٹتے ہیں۔ اگر کرنل فریدی سنجیدگی کا مرکب ہے تو کیپٹن حمید کے مزاج میں شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ابن صفی کی سادہ بیانی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں موجود شگفتہ مزاح قارئین کی دل چسپی کا ایک بڑا محرک تھا، ہے اور رہے گا۔

فکر کی سنجیدگی، لہجے کا وقار، زبان کی انفرادیت، اسلوب کی تازہ کاری، کلام کا رچاؤ، احساس کی شدت، اشعار کی تہہ داری، جذبات کی وارفتگی، اظہار کا بانکپن، ذہن کی اختراع، ابہام سے پاک رمزیت، روشن علامتیں، خوش رنگ تشبیہات، منفرد لفظیات، خود کلامی کی لذت، تحیر آمیز شعری فضا اور بہت کچھ جس سے ابن صفی کا تخلیقی شناخت نامہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے ہاں بیک وقت اتنی خوبیاں ہونا ایک بہت بڑی بات ہے۔ ابن صفی نے شاعری کم کی مگر جتنی بھی کی وہ ان جملہ خصائص سے بھرپور ہے جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا ہے۔ جس دور میں ابن صفی نے شاعری شروع کی وہ دور تقلید کا دور تھا۔ بہت سے شعرا اسی طرح کسی نہ کسی استاد کا رنگ اپنی شاعری پر منطبق کرتے رہے۔ ایسے ماحول میں انھوں نے مختلف راستے اختیار کیے جو بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ابن صفی کی نظمیں ہوں یا غزلیں، اپنی کلاسیکی روایات، جمالیات اور بے ساختگی کی بدولت انھیں ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ ان کی شاعری میں حیات و کائنات دونوں روشن ہیں اور دونوں پہلوؤں پر انھوں نے مشاہدے اور تجربے کے بعد الفاظ کو شعریت عطا کی ہے۔ ابن صفی کی شاعری کے رموز کو سمجھنے کے لیے اس کی گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہے تبھی وہ راز پائے جاسکتے ہیں جو اس دھیمے مگر شگفتہ لہجے میں پوشیدہ ہیں۔ تاہم سطحی مطالعہ کرنے والوں کو گوہر تلاش کرنے میں مایوسی ہوگی، کیوں کہ طلب میں جنوں نہ شامل ہو تو عشق کے مفہوم واضح نہیں ہوتے۔

☆☆☆☆

ناقدین و معاصرین کی آرا

بابائے اردو مولوی عبدالحق

اس شخص کا اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔[۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ

ابھی مجھ سے سوال پوچھا گیا ہے کہ کیا جاسوسی ادب، ادب کا حصہ ہے، کیا جو مقبول عام ادب ہے یا تفریحی ادب وہ ادب کا حصہ ہے؟ اس کے جواب میں میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اس وقت ادبی تھیوری جو منزلیں طے کر چکی ہے، اس میں پاپولر لٹریچر اور جو Highbrow Literature ہے یا جس کو آپ کہیں ہائی لٹریچر۔ ان میں فرق اور امتیاز کی سرحدیں دھندلا چکی ہیں اور اگر جاسوسی ادب، ادب نہیں ہے تو جاسوسی کے ساتھ لفظ ادب کیوں لگاتے ہیں؟ پہلے تو یہ ہے کہ ہم خود تنگ دامانی کا شکار ہیں اور پھر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور پھر جب ادبی تاریخیں لکھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے، جنھوں نے ابن صفی کو ناگری میں بھی پڑھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہماری جتنی معاصر تاریخیں ہیں اردو ادب کی، وہ ابن صفی کے Contributions اور ان کے ذکر سے خالی ہیں۔[۲]

فیض احمد فیض

ابن صفی کی شہرت سن کر میں نے بھی انھیں پڑھنے کا فیصلہ کیا اور پڑھنے کے بعد دل چسپ پایا۔[۳]

شمس الرحمن فاروقی

ابن صفی ہمارے زمانے کے مقبول ترین ناول نگار تھے اور ابھی ان کی مقبولیت باقی ہے، چاہے پہلے جیسی نہ ہو۔ جب مجھ جیسے طالب علم کتابوں کی دکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے کہ ابن صفی کا ناول سب سے پہلے ہمارے ہاتھ آ جائے۔ اردو ہی نہیں، دنیا کے جاسوسی ادب میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی جاسوسی ناول نگار کی موت کے اتنی مدت بعد بھی اس کے ناول پڑھے جاتے رہے ہوں۔ ایک بات اور

ہے جس میں ابن صفی ہماری تحسین اور استعجاب آمیز خراج عقیدت کے مستحق دار ہیں۔ انھوں نے بہت کم عمر پائی اور اس میں بھی کئی برس تک وہ اس قدر بیمار رہے کہ کچھ بھی پڑھنے لکھنے کے اہل نہ رہے۔ لیکن انھوں نے خود کو اس بیماری سے آزاد کیا اور دوبارہ نہایت دل جمعی اور مستعدی سے لکھنے میں مشغول ہو گئے اور بیماری سے اٹھنے کے بعد ان کے قلم میں کوئی لغزش یا ان کی رفتار نگارش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ابن صفی جیسا زود نویس اور کثیر نویس اردو ادب کی تاریخ میں شاید کوئی نہیں ہے۔ [۴]

انتظار حسین

ابن صفی ہمارے زمانہ، طالب علمی میں بیسٹ سیلرز میں آتے تھے۔ اب ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد ہمارے نقادوں نے ان کی جانب توجہ دی ہے۔ ادب کی تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے کہ ایک وقت میں کسی کے بارے میں قائم کی ہوئی رائے اگلے دور میں جا کر بدل جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ [۵]

ڈاکٹر توصیف تبسم

ابن صفی کی نثر ہو یا شاعری دونوں میں تخلیقی جمالیات، بصری حسیت، فن کارانہ شعور، گہرا مشاہدہ، احساس کی صداقت، زبان کا غیر معمولی تخلیقی استعمال، اسلوب اور تکنیک کے نئے نئے تجربات اور موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ذہنی ونفسیاتی کشمکش اور انسان کی داخلی کیفیات کو بھی موضوع بنایا ہے اور ان کی بڑی خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔ ان کی تحریر اتنی خوب صورت ہے کہ ان کے طرز نگارش پر طلسم نگاری کا گمان ہوتا ہے۔ [۶]

رضا علی عابدی

غنیمت ہے کہ بعد میں قدرے تاخیر سے اہل ادب کی آنکھ کھلی اور خیال آیا کہ جس شخص کے گزر جانے سے ادب کے دامن میں سوراخ ہو گیا ہے اس کے بارے میں آنے والی نسلیں پوچھیں گی تو کیا جواب دیں گے۔ مقام شکر ہے کہ اب ابن صفی مرحوم کا ذکر چھڑا ہے اور انھوں نے اردو فکشن کو جو آبرو عطا کی ہے اس کا احساس بیدار ہوا ہے۔ [۷]

پروفیسر سحر انصاری

ابن صفی نے لوگوں کو فکشن پڑھنے پر آمادہ کیا۔ ان کے مداحوں میں کئی ثقہ حضرات شامل تھے جیسے مجنوں گورکھپوری، ابو الخیر کشفی، انجم اعظمی۔ جب میں ۱۹۸۱ء میں افغانستان گیا تو میں نے دیکھا کہ فوجی

اور جلال آباد جیسے شہروں میں لوگ ابن صفی کے ناول پڑھ رہے تھے۔ ابن صفی نے درحقیقت ایک خلاقانہ ذہن پایا تھا۔ وہ محمد طنز نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے۔[۸]

امجد اسلام امجد

جو شہرت اور مقبولیت ابن صفی کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے ناولوں کو ملی اس کی کوئی مثال کم از کم اردو کے جاسوسی ادب سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ ابن صفی کا کمال یہ ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جاسوسی کردار تخلیق کیے جہاں جرم و سزا کا پس منظر سرے سے موجود ہی نہ تھا جس کو بنیاد بنا کر انگریزی میں اگاتھا کرسٹی، ارل سٹینلے گارڈنر، ہیڈلے چیز اور جیمس ہیڈلے چیز اور ان کی طرح کے بے شمار ناول نگاروں نے اپنی برش قلم اور ذہن رسا کے جوہر دکھائے۔ ممکن ہے کہ آپ کو ابن صفی کے تخلیق کیے ہوئے مشہور کرداروں مثلاً کرنل فریدی، کیپٹن حمید، عمران، قاسم، جوزف، جولیا، انور، رشیدہ، تھریسیا بمبل بی، اتھانسے، ہیکس لو، ڈاکٹر ڈریڈ، سنگ ہی، فولادی وغیرہ سے ملتے جلتے کرداروں کی جھلک عالمی جاسوسی ادب میں کہیں کہیں مل جائے لیکن جس طرح سے ابن صفی نے ان کی تشکیل کی ہے اور ان کرداروں کو Visuals کی مدد کے بغیر صرف قلم کے زور پر قارئین کے دل و دماغ پر نقش کر دیا ہے، وہ انہی کا کمال ہے۔ ابن صفی کی دوسری خوبی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا ان کے مکالموں کی برجستگی اور روانی ہے۔ ان کی تحریریں اکثر آپ کو سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہیں کہ وہ باتوں باتوں میں ادب، نفسیات، سماجیات، تہذیب، قانون کی پاسداری اور فلسفے کے حوالوں سے دانش کے موتی بکھیرتے چلے جاتے ہیں لیکن یہ کام وہ اس قدر مہارت اور باریکی سے کرتے ہیں کہ تحریر کی روانی میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا اور قاری غیر محسوس طریقے سے بہت سی اہم اور گہری باتیں سیکھ اور سمجھ جاتا ہے۔ یہاں مجھے ناقدوں کے اس رویے کے حوالے سے کہ جاسوسی ادب کو اعلیٰ اور معیاری ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سحر کی دنیا میں ضیا محی الدین شو میں ابن صفی کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آ رہا ہے۔ ضیا صاحب نے کہا "کیا بات ہے آپ کی کتابیں لائبریریوں کی الماریوں میں نظر نہیں آتیں؟" ابن صفی کا جواب تھا کہ یہ اس لیے کہ لائبریری میں نظر نہیں آتیں کہ یہ لوگوں کے سرہانوں کے نیچے ہوتی ہیں۔[۹]

رئیس امروہوی

یہ میری کوتاہی اور کم توفیقی ہے کہ میں ابن صفی کی حیرت انگیز عبارت آرائیوں، بے مثال کردار سازیوں اور خیرہ کن افسانہ طرازیوں سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ لیکن مجھے اندازہ ہے اور میرے علم میں

ہے کہ جاسوسی ادب پڑھنے والا اور اسے پسند کرنے والا طبقہ کس ذوق شوق سے ہر مہینے ابن صفی کے نئے ناول کا انتظار کیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں بھی ان کی مقبولیت کا یہی عالم تھا۔ ان کے طرزِ بیان میں عجیب طرح کی ساحرانہ کشش تھی اور جاسوسی کارناموں کی تشکیل و تدوین میں ان کے کمالات کا اعتراف ہر شخص کرتا تھا۔ ابن صفی مرحوم کی تقلید جس وسیع پیمانے پر کی گئی وہ بجائے خود ناقابلِ تصور ہے۔ شاید ہی اس عہد میں کسی ناول نگار کو اتنے مقلد اور اتنے چربہ ساز نصیب ہوئے ہوں۔ بسیار نویسی کے باوجود ان کے بیان کی تازگی اور موضوع کی ندرت آخر تک مسلّم تھی۔[۱۰]

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

میں نے ابن صفی کی جاسوسی دنیا کو کبھی نہ تو طاقے میں چھپایا اور نہ کتابوں میں دبایا۔ ہمارے "دانش ور" اسے عامیانہ بات سمجھتے مگر ان دنوں وہ سب مل کر میری جارحیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی پوچھتا کہ ابن صفی کو کیوں پڑھتے ہو۔ پوری قوت سے جواب دیتا کہ ابن صفی آپ کی نسل کے عظیم ناول نگار سے بہتر زبان لکھتا ہے۔ ان دنوں محمد حسن عسکری صاحب نثر کے مٹتے ہوئے فن پر آزردہ تھے۔ میں نے انھیں ابن صفی کی دو تین ناولیں پڑھنے کو دیں۔ اور پھر معاملہ یہ ہوا کہ وہ ہر مہینے پوچھتے "کشفی صاحب نیا ناول آیا"۔ جن لوگوں کو میں نے مشرف بہ ابن صفی کیا ان میں سرشار صدیقی بھی شامل ہیں اور وہ اس بات کا اعتراف بھی تحریری طور پر کر چکے ہیں۔ ناروے سے ایک اردو اسکالر فن تھیسین پاکستان آئے تھے ان سے بھی میں نے ابن صفی کی اہمیت پر گفتگو کی اور انھوں نے عمران سیریز کے کتنے ہی ناول اپنے قیام کے دوران میں پڑھے۔[۱۱]

علی سفیان آفاقی

ماشاءاللہ ابن صفی کے پڑھنے والوں کی دیوانگی اور شوق کا بھی کیا عالم تھا، بقول شاعر "یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے"۔ ہر نوجوان کے ہاتھ میں ابن صفی کے ناول نظر آتے تھے۔ انھوں نے انوکھے اور نت نئے کردار تخلیق کیے تھے۔ ایک نئی دنیا پڑھنے والوں سے متعارف کرائی تھی۔ انھیں اپنے انداز کے لکھنے والوں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل تھا۔ انھوں نے ہلکے پھلکے ادب سے پڑھنے والوں کا تعارف کرایا اور ساتھ ہی نئے نئے دلچسپ اور منفرد کردار بھی تراشے جن کے شیدائیوں کی کمی نہ تھی۔ وہ وقت اور زمانے کے مطابق تحریروں کے خالق تھے۔ ان کا انداز ان ہی پر ختم ہو گیا لیکن اس زمانے کے مقبول لکھنے والوں میں ان کا مقام کوئی دوسرا حاصل نہ کر سکا اور نہ کر سکے گا۔ انھوں نے جاسوسی ادب میں بالکل

نیا انداز پیش کیا تھا۔ وہ صاحب طرز ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے قارئین کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں تھی۔ آج ہیری پوٹر جیسے کرداروں کا چرچا ہے۔ ابن صفی کے زمانے میں عمران، کرنل فریدی، کیپٹن حمید، قاسم کا چرچا تھا۔ یہ کردار بے انتہا مقبول اور پسندیدہ تھے۔ یہ سب ان کے اپنے تخلیق کیے ہوئے دلچسپ زندگی سے بھرپور مجسم جو کردار تھے جو جیتے جاگتے بھی تھے اور تبصرہ بھی کر دیا کرتے تھے۔ عمران سیریز اپنی طرز کی ایک نئی سیریز تھی۔ جس کے شائقین ہر ماہ بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ ابن صفی نے ساری زندگی اپنی توجہ جاسوسی ناولوں پر مرکوز رکھی تھی۔ جاسوسی دنیا نے قیام پاکستان سے پہلے ہی بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔[۱۲]

ڈاکٹر محبوب راہی

جاسوسی ادب کے بارے میں ناقدین کرام کے ارشادات عالیہ سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے مگر جہاں تک اس میدان میں ابن صفی کی منفرد، بے مثال اور لازوال فن کاری کا تعلق ہے، مجھے عرض کرنے دیجیے کہ انھیں نظر انداز کر کے ناقدین سخت بے انصافی اور بددیانتی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ابن صفی جو اپنے جاسوسی ناولوں کے ذریعے تقریباً دو دہائیوں تک کروڑوں اردو قارئین کے ذہن و قلب پر حکومت کرتا رہا، جس نے ایک نہیں، دو نہیں پوری تین نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے، ان کے ذوق مطالعہ کو پروان چڑھایا ہے، جسے اس کے پڑھنے والوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور ادب کے تاجروں نے اس کے قلم کی شادابی کے صدقے میں لاکھوں کے وارے نیارے کیے اور لطف کی بات یہ ہے کہ آج بھی درجنوں ڈائجسٹ صرف ابن صفی کے ناولوں کے بوتے پر روزی روٹی کما رہے ہیں اور یہی ان ناولوں میں ابن صفی کی لازوال فن کاری کا ثبوت ہے۔ اسے سستی شہرت کی کرامت نہ لیجیے۔ کیا نہیں ہے ان ناولوں میں، طنز و مزاح کے بہترین شہ پارے ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب، اعلیٰ انسانی اقدار، اخلاقیات، مذہبیات، سائنس، سیاست اور فلسفہ حیات و ممات کی مدلل اور متوازن آمیزش ہے ان میں، جو مختلف معیار و مزاج کے حامل ہر عمر اور ہر طبقے کے قارئین کو یکساں متاثر کرتی ہے۔[۱۳]

ڈاکٹر خالد جاوید

اردو میں جاسوسی ناول پڑھنے والوں کا ایک مختصر سا حلقہ تو تھا جو تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجموں اور ظفر عمر کے چند ناولوں نے پیدا کر دیا تھا مگر ابن صفی نے تو اس تمام منظر نامے کو ہی بدل دیا۔ ان سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں اکرم الہ آبادی، عارف مارہروی، اظہار اثر، مسعود جاوید، جمیل انجم اور

انجم عرشی وغیرہ نے اپنے ناولوں میں زیادہ سے زیادہ سسپنس اور بھیانک پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس تخلیقی توانائی سے خالی تھے جو صرف ابن صفی کا خاصہ تھی۔ تجسس اور ہیبت ناکی کے عناصر کو مرکزی اہمیت دیتے رہنے کے باوصف وہ ابن صفی کی رمز کو سمجھ نہیں پائے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کے اردو کے ادیبوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس پر ابن صفی کے بیانیہ کا کوئی اثر نہ پڑا ہو۔ ان کے کالموں کی نقل کرنا تو عام سی بات ہے۔[۱۴]

پروفیسر مجنوں گورکھپوری

ابن صفی کی زبان ایسے معیار کی ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ طبقے میں قبول اور پسند کی جاتی ہے۔ ان کی زبان میں ادبی چاشنی بھی ہوتی ہے اور محاوروں کا لطف بھی ہوتا ہے جو افسانے کی گیرائی اور دلکشی کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ اردو میں جدید جاسوسی افسانے کی ایک مستقل صنف کی حیثیت سے ابن صفی نے ابتدا کی وہ اب تک لکھے جا رہے ہیں اور ان کی تقلید میں نوجوان جاسوسی افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی ہے۔[۱۵]

حسن نثار

نہ جانے اکثر لوگ اس بات کا اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ انہیں پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کرنے میں وہ شخص سنگ میل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے تو اعتراف ہے کہ گھریلو ماحول کے علاوہ پڑھنے کے شوق میں شدت پیدا کرنے بلکہ گھنٹوں کے حساب سے بے تکان پڑھتے چلے جانے کی عادت اسی آدمی کی عطا ہے، جس کی نثر جیسی نثر کوئی دوسرا لکھ سکا نہ اس جیسے کردار تو شاید آئندہ صدیوں تک کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکے۔ نوجوانی بہت پیچھے رہ گئی، جوانی بھی غروب ہوتی جا رہی ہے۔ موضوعات اور ان کی ترجیحات مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہیں لیکن کرنل فریدی اور کیپٹن حمید سے لے کر عمران سیریز کے عمران اور جولیانافٹز واٹر تک آج بھی حقیقی کرداروں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھرتے ہیں۔ میں عظیم تخلیق کار اور اپنے فن کے امام مرحوم ابن صفی کی بات کر رہا ہوں جو برطانیہ میں ہوتا تو اسے "سر Sir" کا خطاب ملتا۔[۱۶]

ظفر اللہ خان

میں ابن صفی کے ناول شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے جاسوسی ناول سے دلچسپی نہیں ہے البتہ ابن صفی سے دلچسپی ہے۔ وہ اپنے جاسوسی ناول سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان کی زبان بڑی رسیلی

ہے۔ان کے جملے نشتر ہیں۔وہ اپنی عبارت میں ظرافت اور طنز کے پھول بکھیرتے ہیں۔ان کے جاسوسی ناول کا پلاٹ ان کی بوقلمونی سے تختۂ گل بن جاتا ہے۔[۱۷]

احمد اقبال

ابن صفی کی تخلیقات پر اظہار رائے میرے لیے دشواری کا باعث ہے۔اصل آزمائش یہ ہے کہ جاسوسی ادب میں وہ میرے پیشرو ہی نہیں استاد بھی ہیں اور میں کہوں کہ اس راہ پر میں نے انھی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔۔صرف کوشش۔۔تو یہ غلط نہ ہوگا۔شاگرد کا استاد کے مقام سے کیسا موازنہ۔۔۔ وہ اپنے فن کے امام تھے اور میں فقط ایک ادنیٰ پیروکار۔۔ان کے ان گنت مداحوں پرستاروں میں سے ایک۔۔۔جو تھوڑی بہت نیک نامی مجھے ملی اسے میں انھی سے منسوب کرتا ہوں۔زمانے سے نہیں کچھ ادب کے ٹھیکیداروں سے شکوہ ہے کہ ان کی ادبی حیثیت اور شاعرانہ صلاحیت کو اس درجہ تسلیم نہ کیا، نہ کرنے دیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن اس سے ابن صفی کی قدر و منزلت میں فرق نہیں پڑ سکتا۔۔مشک آن است کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید۔[۱۸]

سید محمد اشرف

بچپن اور لڑکپن میں انسانی ذہن میں بہت تجسس ہوتا ہے، بے شمار خواہشیں اور لاتعداد خوف اور ان سے زائیدہ ایک عجیب سی تنہائی۔ابن صفی ایسی ہی تنہائیوں کے محبوب ساتھی تھے۔اس ساتھ نے جو لطف اور مسرت بخشی، اس نے زندگی کے باقی ایام بھی اپنی گرفت میں رکھے۔اسرار و رموز، قصہ گوئی، ظرافت، جملوں میں ناقابل تبدیل لفظوں کا استعمال، عبارت کی روانی، شگفتگی اور اعلیٰ درجے کی شائستگی، نئے نئے ان دیکھے جغرافیائی خطوں کی سیر۔۔۔اور ابن صفی طلسمی فضا بنانے میں بھی ماہر تھے۔"قاتل سنگ ریزے"، شاہی نقارہ، برف کے بھوت، زمین کے بادل، معزز کھوپڑی، بلکہ ان کی ملک کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔زبیر رضوی کے رسالے "ذہن جدید" نے ایک سروے کیا تھا جس میں اردو کے بہترین ناول اور بہترین افسانوں کے نام مختلف عمر کے ادیبوں سے معلوم کیے تھے۔میں نے اپنی پسند کے ناولوں میں ایک نام "شاہی نقارہ" بھی لکھا۔جب سروے شائع ہوا تو کچھ ادیبوں نے ناک بھوں سکوڑ کر اعتراض کیا کہ اپنی پسند کے ناولوں میں جاسوسی ناول کا نام دینا مناسب نہ تھا۔اس کے برخلاف بہت سے دوست خوش بھی ہوئے کہ میں نے ان کے دل کی ترجمانی کی تھی۔ذاتی طور پر میں نہ خوش تھا نہ اداس، مجھے ایک بے پناہ آسودگی کا احساس ہوا تھا کہ شاہی نقارہ کا نام لکھ کر دراصل اس ادیب کی خدمت

میں ایک چھوٹا سے نذرانہ پیش کیا تھا جس نے طرف، بھرا نش، تنہائی اور متعدد بیماریوں سے بھرپور آزما تو جوان کے زخموں پر بار بار خفتا خفتا مرہم رکھا تھا۔ [۱۹]

Prof. Finn Thiesen,

Professor, Urdu Language and Literature,

Oslo University, Norway.

Mushtaq Ahmed Qureshi, Editor Nae Ufaq!

I am glad to find out that you are going to publish a Special Issue on Ibne Safi. It is because in my opinion Ibne Safi still has not achieved the position in Urdu Literature that he really deserves. Or you can say that Urdu critics have not recognized his importance. Perhaps we should not be too sad on this because after all what could these critics do to harm Ibne Safi? Everyone knows Ibne Safi and is fond of reading him. On Page 113 of "Raa'ee ka Parbut" Ibne Safi himself says,"Don't worry about what people think of you, always keep an eye on what you are!" We too, would not worry that the critics did not recognize Ibne Safi, we would keep an eye on what he himself was!

Yours,

Finn Thiesen

Professor Urdu language and Literature,

Oslo University, Norway. [۲۰]

Christina Oesterheld,

South Asia Institute, Heidelberg

I would argue that in Ibne Safi the sheer delight of story telling

and the experience of commercial success were to some degree combined with the critical impetus of his youth, exemplified by his engagement in Progressive Writers Association. He usually abstained himself from ideological statements and explicit social criticism, but his critical stance is perhaps most pronounced with regard to the corrupt state and its connivance with the designs of Super Powers which are felt to run counter to the genuine interests of the people[۲].

ایک انٹرویو

(یہ انٹرویو ۱۹۷۰ء میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام "گوشۂ عافیت" کے لیے ریکارڈ کیا گیا اور یہ اس کتاب کے لیے جناب نصیر ترابی اور ڈاکٹر خورشید عبداللہ نے فراہم کیا ہے جس کے لیے مصنف ہر دو کا بے حد شکر گزار ہے)

جاسوسی ناول نگاری کا جب بھی ذکر آتا ہے تو ابن صفی کی شخصیت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ ابن صفی کو اس صنف کا مرد میدان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ابن صفی جاسوسی ناولیں ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں اور ہمارے پڑھنے والوں کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انھوں نے اب تک ۲۰۰ سے زائد ناول لکھے ہیں۔ ابن صفی نے کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے کرداروں کو اپنے ناولوں کے ذریعے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ آج کے پروگرام گوشۂ عافیت میں آپ ابن صفی سے ملیں گے۔ آئیے پروگرام سنیے، "گوشۂ عافیت"۔

نصیر ترابی: ابن صفی صاحب وہ کون سے محرکات تھے جن کے سبب آپ اس صنف کی جانب راغب ہوئے۔

ابن صفی: سب سے بڑا محرک تو خود میری اپنی مہم پسند طبیعت تھی۔ ورنہ میرے ادبی کیریئر کی ابتدا مختصر کہانیوں، طنزیہ مضامین اور شاعری سے ہوئی تھی لیکن وہ جو مہم پسندی تھی طبیعت میں وہ مجھے کسی طور بھی مطمئن نہ کر سکی اور مجھے اس صنف کی طرف آنا پڑا۔ اور پھر ایسے واقعات پیش آئے کہ جن کی بنا پر میں نے سوچا کہ مناسب یہی ہے کہ میں صرف اس صنف پر توجہ دوں۔

نصیر ترابی: کس قسم کے واقعات، ذاتی نوعیت کے

ابن صفی: ہاں ذاتی نوعیت کے مثال کے طور پر ایک بار میں وہاں یونیورسٹی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے کچھ اساتذہ بھی تھے ان میں ایک بزرگ نے یہ فرمایا کہ اردو میں صرف جنسی لٹریچر کی زیادہ مانگ ہے، کھپت ہے اور ایسے ہی بیشتر لکھنے والے ہیں زیادہ جو اس قسم کی کتابیں چھاپ رہے ہیں تو میں نے اپنے ان استاد سے گزارش کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب ایسا نہیں ہے ابھی بھی ایسی راہیں ہیں کہ اگر مناسب طریقے سے ان پر چلا جائے اور قاعدے سے کام کیا جائے تو کام ہو سکتا ہے اور منفعت بخش بھی ہو سکتا ہے اور اس کی کھپت بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا

بات میری سمجھ میں آئی نہیں آپ کی۔ میں نے کہا اچھا ڈاکٹر صاحب میں کوشش کروں گا کہ کچھ دنوں بعد میں اس کی مثال پیش کروں۔ اس طرح میں نے اس صنف میں لکھنا شروع کیا تھا۔

نصیر ترابی: اچھا ابن صفی صاحب، زود نویسی کے باعث آپ کی کہانیوں میں واقعات کے اعتبار سے بھی کوئی تکرار یا مماثلت تو نہیں پیدا ہو جاتی۔

ابن صفی: بھئی ابھی تک تو مجھے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں ملی، میری ڈاک بڑی لمبی چوڑی ہوتی ہے اور پڑھنے والوں کے خطوط بے تحاشا آتے ہیں۔ ابھی تک کسی نے مجھے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی کہ کہیں بات میں یا واقعات میں کسی قسم کی مماثلت پیدا ہو گئی ہو۔

(بیک گراؤنڈ میں پراسرار قسم کی موسیقی چلتی ہے)

(نصیر ترابی کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے چند مکالمات پڑھتے ہیں)

نصیر ترابی: اچھا صفی صاحب آپ کی کہانیوں کے یہ کردار کیا آپ کی خیالی اختراع ہیں یا یہ لوگ ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

ابن صفی: جی صاحب، یہ قطعی طور پر ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ بعض کردار ایسے ہیں کہ جنھیں پالش کرنے کے لیے کسی قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

نصیر ترابی: اچھا ابن صفی صاحب کیا آپ کی کہانیوں نے عوامی زندگی پر کوئی انفرادی یا اجتماعی اثر ڈالا ہے۔

ابن صفی: جناب، انفرادی اثر بھی ڈالا ہے اور اجتماعی اثر بھی ڈالا ہے۔ سب سے بڑا اجتماعی اثر تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ میری کتابوں کے پاپولر ہونے سے پہلے لوگوں میں اردو پڑھنے کا یا لگ سے اردو کا مطالعہ کرنے کا ذوق و شوق نہیں پایا جاتا تھا جتنا بعد میں آیا۔ جنھیں آپ بہت ہی خالص ادبی کتابیں کہتے ہیں وہ بھی پڑھی جانے لگی ہیں۔ وہی لوگ ان کتابوں کو پڑھنے لگے ہیں جو میری کتابیں پڑھتے تھے، اس لیے کہ پڑھنے کی عادت پڑ گئی ہے ان کی، اور انھیں جب کوئی جاسوسی کتاب نہ ملی تو پھر وہ اٹھا لیتے ہیں جو کتاب بھی ہاتھ آئے۔ ان میں اگر اتفاق سے ادبی کتابیں بھی ان کے ہاتھ لگ جاتی ہیں تو پڑھتے ہیں پھر وہ۔

نصیر ترابی: دیکھیے شاید اسی وجہ سے آج کل ڈائجسٹوں میں پراسرار کہانیوں کا جو سلسلہ ہے۔

ابن صفی: ہاں بالکل قطعی طور پر یہ ہے کہ لوگ تفریح چاہتے ہیں اور وہ تفریح پسند ہی ہیں جنھوں نے حوصلہ افزائی کی ڈائجسٹوں کی۔

نصیر ترابی: صفی صاحب، مغربی ادب میں جاسوسی کہانیوں کو ادب کی ایک باقاعدہ صنف تسلیم کیا جاتا

ہے لیکن ہمارے ہاں ایسا کیوں نہیں۔

ابن صفی: میں قطعی طور پر مایوس نہیں ہوں اس سلسلے میں اور ابھی کتنے دن ہوئے ہیں اس صنف کو پروان چڑھے ہوئے۔ اور رہا انگریزی ادب کا معاملہ وہ ایک قدیم زبان ہے اور اس میں عرصہ دراز سے یہ صنف موجود ہے لہٰذا میں مایوس نہیں ہوں اس سے۔ اصل میں تو یہ ہوا کہ یہ صنف اردو میں ایسے حضرات کے ہاتھوں پڑھنے والوں تک پہنچی جو حقیقتاً ادیب نہیں تھے بلکہ صرف مترجم ہی تھے، یہی وجہ تھی

نصیر ترابی: مثلاً اگر آپ کوئی مثال دے سکیں۔

ابن صفی: مثلاً منشی تیرتھ رام فیروزپوری صاحب، وہ آپ کو صرف مترجم نظر آئیں گے۔ کسی ادیب کے ہاتھوں اگر یہ ترشے ہوئے ہوتے تو میرا خیال یہ ہے کہ یہ پڑھے لکھے لوگوں تک بھی پہنچتے اور وہ انھیں پسند بھی آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی جلدی وہ مقام حاصل نہیں کرسکی یہ صنف جو اس کی حیثیت ہے انگریزی میں۔

نصیر ترابی: ابن صفی صاحب! عام خیال یہ ہے کہ جاسوسی کہانی نئے ذہنوں کی بے راہ روی کا باعث ہوتی ہے تو کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں۔

ابن صفی: جناب ذہنی بے راہ روی کی تاریخ اتنی پرانی ہے کہ جتنی انسان کی اور آپ یہ بتائیں کہ ہابیل اور قابیل کا واقعہ جب ہوا تھا تو کیا اس وقت میں موجود تھا اور جاسوسی کہانیاں لکھ رہا تھا۔ لیکن بہرحال وہ واقعہ ہوا تھا تو یہ ساری چیزیں جبلتوں اور ماحول کے تحت ہوتی ہیں۔ ان کا اس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے کہ جاسوسی لٹریچر یا کسی اور قسم کا لٹریچر اس قسم کی بے راہ روی میں مبتلا کرسکتا ہے لوگوں کو۔

نصیر ترابی: لیکن کیا پڑھنے والوں کی اپنی نفسیاتی کمزوریوں کا دخل نہیں ہے۔

ابن صفی: ہاں بالکل ہے، ہوتا ہے۔ ایسا ہے کہ جس ماحول میں وہ پلے بڑھے ہیں، پروان چڑھے ہیں ہوسکتا ہے اس میں کچھ خامیاں ہوں جنھوں نے ان کو پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار کر رکھا ہو کہ اگر کچھ تو کہیں مل جائیں۔

نصیر ترابی: ابن صفی صاحب! لکھتے وقت آپ کے ذہن میں کوئی خاص نظریہ ہوتا ہے میری مراد یہ ہے کوئی اصلاحی یا افادی۔

ابن صفی: یقیناً میری نظروں میں ہوتا ہے اور سب سے بنیادی جو نظریہ ہے میری کتابوں میں یا میرا

مقصد وہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو قانون کا احترام کرنا سکھاؤں۔ اور پھر یہ کہ زندگی کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جسے میں نے اپنی کتابوں میں نہ چھیڑا ہو اور کوشش نہ کی ہو کہ اس کا حل پیش کروں۔

نصیر ترابی: کیا اس سلسلے میں کوئی قانون کا بھی مطالعہ آپ نے کیا ہے۔

ابن صفی: قانون کا مطالعہ باقاعدہ طور پر تو نہیں کیا جیسے سب کچھ پڑھا ہے ویسے قانون بھی پڑھا ہے میں نے۔ لیکن بہر حال یہ جانتا ہوں کہ قانون ہی کی بنا پر دنیا میں امن و امان رہ سکتا ہے۔

نصیر ترابی: ابن صفی صاحب! ہمارے بہت سے سننے والوں یہ سن کر یقیناً تعجب ہوگا کہ آپ ایک بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ تو کیا آپ اپنے سننے والوں کو اپنی کوئی نظم یا غزل سنائیں گے؟

ابن صفی: چند شعر اگر آپ کہیں تو سنا سکتا ہوں، مجھے اگر آپ نے پہلے بتا دیا ہوتا تو بیاض اپنی لے آتا میں، ملاحظہ ہوں:

راہ طلب میں کون کسی کا، اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے، رشک غزالاں، سب جانے پہچانے ہیں
تنہائی سی تنہائی ہے، کیسے کہیں، کیسے سمجھائیں
چشم و لب و رخسار کی تہ میں روحوں کے ویرانے ہیں
اف یہ تلاش حسن و حقیقت، کس جا ٹھہریں، جائیں کہاں
صحن چمن میں پھول کھلے ہیں، صحرا میں دیوانے ہیں
ہم کو سہارے کیا راس آئیں، اپنا سہارا ہیں ہم آپ
خود ہی صحرا، خود ہی دوانے، شمع نفس پروانے ہیں
اپنے وجود کی مستی سے ہم رندوں کے احوال نہ پوچھ
قدم قدم پہ چھلکے خود سے نفس نفس مے خانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو! ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا، باقی سب افسانے ہیں

نصیر ترابی: واہ واہ، کیا شعر ہیں۔

(ایک بار پھر میوزک بجتا ہے)

نصیر ترابی: سامعین کرام! آج کے پروگرام میں ہم نے آپ کی ملاقات ابن صفی صاحب سے کرائی۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیجیے اللہ حافظ۔

[۹] عبد اللطیف، "میرے بھائی جان" مشمولہ "نئے افق" شمارہ اگست ۱۹۸۶ء، مدیر مشتاق احمد قریشی، کراچی
ص ۴۲، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:
http://www.wadi-e-urdu.com/category/articles-of-nae-ufaq-1986/
(مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۲۱:۲۰)

[۱۰] ایضاً، ص ۴۳

[۱۱] ابن صفی، "قلم قلم" مشمولہ "الف لیلیٰ ڈائجسٹ" شمارہ جولائی ۱۹۷۸ء، مدیر ایچ اقبال، کراچی
ص ۱۳۲، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:
http://www.compast.com/ibnesafi/essay5a.htm
(مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۱۸:۲۵)

[۱۲] ابن صفی، "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا" مشمولہ "ماہنامہ عالمی ڈائجسٹ" جنوری ۱۹۷۰ء، مدیر زاہد ، ص
۱۴۰-۱۴۳، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:
http://www.compast.com/ibnesafi/essay6b.htm
(مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۲۲:۱۵)

[۱۳] عبد اللطیف، "میرے بھائی جان" مشمولہ "نئے افق" شمارہ اگست ۱۹۸۶ء، مدیر مشتاق احمد قریشی، کراچی
ص ۴۲، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:
http://www.wadi-e-urdu.com/category/articles-of-nae-ufaq-1986/
(مورخہ: 30 مئی 2017ء وقت: 15:20)

[۱۴] راشد اشرف، مرتب، "ابن صفی: شخصیت اور فن"، کراچی: بزمِ تخلیقِ ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸

[۱۵] http://www.compast.com/ibnesafi/biography.htm
(مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۱۸:۲۵)

[۱۶] ایضاً

[۱۷] http://ecc.ac.in/Ecc-coll-profile (مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۲۲:۲۵)

[۱۸] http://www.compast.com/ibnesafi/biography.htm
(مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۲۲:۲۵)

[۱۹] ایضاً

[۲۰] ابن صفی، "قلم قلم" مشمولہ "الف لیلیٰ ڈائجسٹ" شمارہ جولائی ۱۹۷۸ء، مدیر ایچ اقبال، کراچی
ص ۱۳۲، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:
http://www.compast.com/ibnesafi/essay5a.htm
(مورخہ ۳۰ مئی ۲۰۱۷ء وقت: ۱۸:۲۵)

[۱۰] ایضاً، ص ۹۱

[۱۱] راشد اشرف، انٹرویو، "ابن صفی: شخصیت اور فن"، کراچی، بزم تخلیق ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۰

[۱۲] احمد صفی، ای میل بنام راقم، ۱۸ اگست ۲۰۱۰ء

[۱۳] مرتب: عارف اقبال، "ابن صفی: ادبی مشن اور کارنامے"، دہلی، اردو بک ریویو، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۲

[۱۴] ڈاکٹر خالد جاوید، "ابن صفی: چند معروضات"، مشمولہ "اردو میں پاپولر لٹریچر کی روایت"، مرتبین: اظہار عثمانی، ارتضیٰ کریم، دہلی، اردو اکادمی، ص ۱۰۱-۱۰۲

[۱۵] [illegible] گورکھپوری، "اردو میں جاسوسی فسانہ"، مشمولہ "الف لیلیٰ ڈائجسٹ"، شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء، مدیر اعجاز اقبال، کراچی، ص [illegible]، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:

http://www.wadi-e-urdu.com/category/alif-laila-digest-1972-ibne-safi-number/

(موصولہ: ۱۸ اگست ۲۰۱۰ء، وقت: ۲۱:۱۵)

[۱۶] حسن نثار، "کالم چوراہا"، مشمولہ "روزنامہ جنگ"، ۲۹ جولائی ۲۰۰۰ء، ابن صفی کی جاسوسی دنیا کی آن لائن [illegible] شامل ہے۔

[۱۷] ظفر اللہ خان، "[illegible] ابن صفی"، مشمولہ "الف لیلیٰ ڈائجسٹ"، شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء، مدیر اعجاز اقبال، کراچی، ص [illegible]، اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے:

http://www.compast.com/ibnesafi/essay16.htm

(موصولہ: ۱۸ اگست ۲۰۱۰ء، وقت: ۲۱:۱۹)

[۱۸] احمد اقبال، ای میل بنام راقم

[۱۹] سید محمد اشرف، ای میل بنام راقم

[۲۰] مراسلہ ڈاکٹر [illegible] بنام مشتاق احمد قریشی، مدیر [illegible]، یہاں دستیاب ہے:

http://www.compast.com/ibnesafi/opinion1.htm

(موصولہ: ۱۸ اگست ۲۰۱۰ء، وقت: ۲۱:۱۹)

[۲۱] ڈاکٹر [illegible] کا مضمون یہاں دستیاب ہے:

http://www.compast.com/ibnesafi/essays/interview.pdf

(موصولہ: ۱۸ اگست ۲۰۱۰ء، وقت: ۲۱:۱۹)

☆☆☆☆

محمد فیصل ۲۴ ستمبر ۱۹۸۰ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سرکاری ملازم تھے۔ ایف ایس سی اور بی ایس سی ملتان کی مشہور درسگاہ گورنمنٹ ایمرسن کالج سے ۱۹۹۷ء اور ۱۹۹۹ء میں پاس کی۔ ۲۰۰۱ء میں انہوں نے کمپیوٹر سائنسز میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز انہوں نے تدریس کے شعبے سے کیا۔ پانچ سال اس شعبے سے وابستہ رہنے کے بعد آج کل ایک سرکاری ادارے میں کمپیوٹر کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ ادب، خصوصاً اردو و انگریزی فکشن اور شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ گزشتہ تین برس سے کراچی سے شائع ہونے والے شاعری کیلنڈر کا انتخاب کر رہے ہیں۔ ان کے مضامین پاکستان اور بیرونی ممالک کے ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے رام پور دبستان کے معروف کلاسیکی شاعر نظام شاہ نظام کی شاعری کا انتخاب کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی تین مزید کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی سلسلے "پاکستانی ادب کے معمار" میں ابن صفی جیسے ہمہ جہت مصنف اور شاعر پر کتاب ''ابن صفی: شخصیت اور فن'' جناب محمد فیصل نے تحریر کی ہے۔

ISBN: 978-969-472-320-4